فہرست

لمعات:

ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کے مضمون پر ایک نظر	ادارہ	3
ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی کی کتاب ''عقوباتِ قرآن اور مفکرِ قرآن جناب علامہ غلام احمد پرویز'' پر تبصرہ	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	6
حضرتِ انسان قرآن کے آئینے میں	آصف جلیل، کراچی	19
قرآنی الفاظ کے مذہبی اور دینی مفاہیم	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی، کراچی	24
ذکر کا مفہوم	غلامی باری، مانچسٹر	35
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویزؒ	38
کھاتہ داران/خریدار حضرات خصوصی توجہ فرمائیں	ادارہ	58

ENGLISH SECTION

'He Forgives or Punishes Whomever He Wants'
By G.A. Parwez
Translated by: Khalid Sayyed 1

احادیث نبوی ﷺ

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو مخابرہ کو نہیں چھوڑتا اس کے خلاف خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھو۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ مخابرہ سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا زمین کو نصف یا تہائی یا چوتھائی (وغیرہ) بٹائی پر لینا یا دینا۔ (ابوداؤد۔۔۔ کتاب البیوع)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں تھے۔ وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے یہ کہہ کر انہیں پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے اب اگر نیچے والوں کو (پانی دے کر) اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں (پانی دے کر) اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ادارہ)

لمحات

ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کے مضمون پر ایک نظر

محترم جناب ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب ہمارے ملک کے ایک ایسے نامور سائنسدان ہیں کہ جن کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ان کا ایک مضمون ''دی نیوز'' مورخہ 25/11/2008 میں It is the judiciary, Stupudity کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے پاکستان کی عدلیہ کی بددیانتی کی تاریخ Trace کی ہے چونکہ اس رسالہ کو عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے' اور نہ ہی کسی سیاسی پارٹی سے اس کا تعلق ہے' اس لئے یہ رسالہ بربنائے احتیاط اس کے کسی واقعہ یا اس کے Contents پر تبصرہ نہیں کرتا' البتہ ڈاکٹر صاحب محترم کی جس ایک بات پر اس مضمون میں نظر ڈالنی ہے اس کے لئے' ان کے مضمون کا مختصر سا خلاصہ پہلے عرض کر دینا ضروری ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں پہلے مولوی تمیز الدین خاں صاحب کے کیس کا تذکرہ فرمایا کہ جس میں جسٹس منیر صاحب نے تاریخی وجوب'' کا سہارا لے کر' غلط فیصلہ دیتے ہوئے ملک غلام محمد کے غلط اقدام کی تصویب کر دی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ذوالفقار علی بھٹو شہید کے کیس کا تزکرہ کیا جس کے متعلق اب ہر شخص کو علم ہے کہ اس دور کے حالات کے تقاضوں کی وجہ سے اس کیس کا فیصلہ مبنی پر عدل نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے' جناب چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری صاحب کے رویوں پر اپنا نقطہ گاہ تحریر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ شروع میں جناب چیف جسٹس صاحب موصوف نے پرویز مشرف صاحب سے بنائے رکھی جس کی وجہ سے انہوں نے جناب زرداری صاحب کی درخواست برائے ضمانت کو درخور اعتناء نہیں سمجھا نیز یہ کہ جج صاحب محترم نے یوسف رضا گیلانی اور جاوید ہاشمی صاحب کو جو سزا دی' اس کو بھی عوام نے بہ نظر تحسین نہیں دیکھا۔ اس کے بعد مقطع کا بند آتا ہے جس میں جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنے کیس کا ذکر شروع کیا ہے' اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ افتخار چوہدری صاحب معمولی معمولی معاملات میں Suo Moto نوٹس لیتے ہیں' لیکن انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے کیس کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی اور جب ایک شہری نے ڈاکٹر صاحب کی حبس بے جا کے سلسلہ میں ایک درخواست دائر کی تو افتخار چوہدری صاحب نے اس درخواست کو مسترد کر دیا کیونکہ درخواست دہندہ ڈاکٹر صاحب کا رشتہ دار نہیں تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنا نظریہ پیش فرماتے ہیں کہ ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کے بعد چونکہ جج صاحب موصوف نے پرویز مشرف صاحب کے خلاف Stand لیا اور ان کے احکامات کو رد کر دیا۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنی چند خامیوں کے باوجود اپنے آپ کو 'Redeem' کر لیا ہے۔ یعنی ''فدیہ دے کر اپنے کو چھڑا لیا ہے''۔ اور اب وہ عدلیہ کی آزادی کی علامت بن گئے ہیں۔ اس وجہ سے جب کوئی شخص مجھ سے ان کی سابقہ غلطیوں کا تذکرہ کرتا ہے تو اس کو میرا جواب بہت سادہ یہ ہوتا ہے کہ:

"Before the Companions of our Holy Prophet embraced Islam, all their previous Sins were forgiven"

بر بنائے احتیاط ڈاکٹر صاحب کے الفاظ بجنسہٖ نقل کر دیئے گئے ہیں اور یہی وہ الفاظ ہیں جن پر اس مختصر سے مضمون میں نظر ڈالنی ہے۔

ڈاکٹر صاحب محترم کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے نہ تو (Forgive) یعنی معاف کرنا' بخش دینے کا قرآنی تصور ہے اور نہ ہی انہوں نے Sin اور Crime کی کوئی تفریق فرمائی ہے۔ نیز یہ کہ انہوں نے اپنے حسن سلوک کے بارے میں جو مثال صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی دی ہے۔ اس مثال کا اطلاق یہاں بالکل نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم کی رو سے برے اعمال کے نتائج ہر نفس انسانی پر برابر مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں (10/61, 7/164, 4/11) یہاں تک کہ صرف ارادے اور خیال کا اثر بھی نفس انسانی پر مرتب ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا اثر ہوتا ہے کہ یہ پھر کسی طرح بھی نفس انسانی سے زائل نہیں ہوسکتا' اور اسی کو گناہ بھی کہا جاتا ہے' اگر یہ اثر کسی ایسے فعل سے مرتب ہوا ہے جس سے کوئی دوسرا انسان یا معاشرہ متاثر ہوا ہے تو یہ اثر' متاثر شدہ شخص کے معاف کرنے سے دور نہیں ہوسکتا' ہمارے ہاں جو دستور ہے کہ مرتے ہوئے شخص سے اپنا قصور معاف کرا لیتے ہیں' تو یہ محض ایک خوش فہمی پر مبنی ہے۔ اگر ایک مرتبہ برے عمل کا اثر مرتب ہو جاتا ہے تو وہ کسی کے معاف کرنے سے دور نہیں ہوسکتا۔ البتہ قرآن کریم نے یہ ایک زریں اصول بھی عنایت فرما دیا ہے کہ: **إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ** (11/1114)۔ نیکیوں کے اثرات برائیوں کے اثرات کو محو و زائل کر دیتے ہیں۔ یعنی اگر کسی شخص نے کسی کے خلاف کوئی جرم کیا ہے' تو اس کے اثرات تو ہر حال میں قائم رہیں گے۔ البتہ اگر اس شخص نے اور بہت سی نیکیاں کر دی ہیں تو ان نیک اعمال کے اثرات' برے اعمال کے اثرات کو Minus کر دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب محترم نے صحابہ کرامؓ کا جو حوالہ دیا ہے تو اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کے دو واقعات ہماری تاریخوں میں مذکور ہیں جو اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔ جب وہ خلافت کے فرائض بخوبی ادا کر رہے تھے تو ان کے ایک دیرینہ دوست نے ان سے کہا کہ عمر! تم نے اسلام کی تبلیغ و توسیع' اور اس کی فتوحات میں اس درجہ محنت کی ہے کہ تم نے اسلام کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ عمر نے اسلام کو چار چاند نہیں لگائے بلکہ اسلام نے عمر کو چار چاند لگا دیئے ہیں' کیونکہ خطاب کی تو اور بھی اولاد ہے' لیکن ان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں' ہمارے نزدیک یہ حضرت عمرؓ کی انکساری اور فروتنی تھی ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کو شہید نہ کیا جاتا تو آج دنیا کا اور نقشہ ہوتا یا حضرت عمرؓ جیسا ایک اور کوئی پیدا ہو جاتا تب بھی یہی صورت ہوتی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دورانِ خلافت میں ان کا بچپن کا ایک دوست ملنے آیا اور اس نے حضرت عمرؓ کو دیکھ کر کہا کہ عمر تم تو بہت اچھے ہو گئے ہو۔ تو حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا کہ ہم اچھے پہلے بھی تھی' اور اچھے اب بھی ہیں۔ پہلے اُس معاشرہ کے اقدار کے مطابق اچھے تھے' اب اِس معاشرہ اور احکامات خداوندی کے مطابق اچھے ہیں یہ فرق' اقدار و نظریات زندگی کے مختلف ہونے سے ہوا ہے ورنہ ہم اقدار کے پیمانوں کے مطابق نہ اس وقت برے تھے' نہ آج برے ہیں۔

اسلام سے پیشتر صحابہ کرامؓ کے سامنے صحیح اقدار یا وحی کی تعلیم نہیں تھی وہ اپنے وضع کردہ رواج و اقدار کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ ظہور اسلام کے بعد انہوں نے اسلام کو درست سمجھا اور اس کو درست سمجھتے ہوئے' اس پر ایمان لے آئے اب وہ اسلام کے قوانین کے پابند ہے۔ ڈاکٹر صاحب محترم نے جو تحریر فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد' ان کے تمام گناہ بخش دیئے گئے' تو قرآن کریم کی رو

سے یہ درست نہیں ہے بلکہ اس کی صحیح حقیقت اس سے قدرے مختلف ہے۔

بعثتِ نبوی سے پیشتر' اسلام کے قوانین جب تک عربوں کے سامنے نہیں آئے' اور وہ ان اعمال کے مرتکب ہوئے جو بعد میں وحی الٰہی میں ممنوع قرار دیئے گئے تھے۔ ان افعال کے ارتکاب میں وہ قابل مواخذہ نہیں رہے۔ قبل اسلام اگر کوئی شخص شراب پیتا تھا' تو چونکہ شراب اس وقت تک حرام قرار نہیں دی گئی تھی اور ان کے معاشرے میں جائز تھی' تو شراب پینا قابل مواخذہ نہیں ہوگا اور یہ ایک Sin شمار ہوگا' لیکن دور جاہلیت میں ہی اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرے' یا اس نے کسی کا سامان لوٹا' تو یقیناً یہ فعل قابل مواخذہ تھا' اور یہ Crime کے زمرہ میں آتا تھا کیونکہ یہ فعل جاہلیت میں بھی مکروہ شمار ہوتا تھا اور اس سے نہ صرف دوسرا شخص متاثر ہوتا تھا بلکہ پورا معاشرہ اس کے اس فعل سے متاثر ہوتا تھا۔ ان کے اثرات ان کے نفوس پر یقیناً مرتب ہوتے رہے جب یہی حضرات ایمان لے آئے تو یہ ان کا اتنا بڑا اقدام تھا کہ اس ایک اقدام کی وجہ سے ان کے نفوس پر جو اثرات مرتب ہوئے انہوں نے ان سابقہ اعمال کے اثرات کو بالکل زائل کر دیا۔ صحابہ کرامؓ میں بھی ایک تو حضرت ابوبکرؓ تھے جنہوں نے اسلام کا پیغام سنا اور فوراً اس پر ایمان لے آئے۔ انہیں حضرات میں وہ اشخاص بھی تھے جنہوں نے اسلام کا ڈٹ کے مقابلہ کیا اور فتح مکہ کے بعد وہ ایمان لائے۔ جن حضرات نے اسلام کا ڈٹ کے مقابلہ کیا یقیناً اس مخالفت کے اثرات ان کے نفوس پر مرتب ہوئے اور ان کا وہ مقام نہیں ہوسکتا جو حضرت ابوبکرؓ یا سابقین فی الاسلام کا مقام عالی تھا اور جنہوں نے کفار کی سخت اذیتیں برداشت کی تھیں اور وہ ان تمام مصائب میں ثابت قدم رہے اس بات کی تصدیق قرآن کریم نے بھی کی ہے کہ: **لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُوْلَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا** (57/10)۔ تم میں سے جس شخص نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا اور جس نے بعد میں کیا برابر نہیں۔ ان کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور جہاد کیا۔ لیکن چونکہ وہ حضرات ایمان لے آئے' اس لئے ان کے صرف ایک عمل نے ان کے سابقہ برے اثرات کو Cover کر لیا۔ لیکن برے اعمال کے اثرات زائل نہیں ہوئے۔ البتہ جنہوں نے قبل اسلام بھی جرائم کم کئے ہوں گے' ان کے اثرات بھی تھوڑی سی نیکیوں سے محو ہو گئے ہوں گے اسلام لانے کے بعد بھی جن صحابہؓ نے اسلام کی زیادہ خدمت کی' ان کے مدارج بھی ان لوگوں سے زیادہ تھے جنہوں نے اسلام کی خاطر کوئی قربانیاں نہیں دیں' تاہم ان کا اسلام لانا ہی ایک اتنا بڑا اقدام تھا کہ جس کی وجہ سے قرآن کریم نے ان سب کے لئے فرمایا: **وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى** (57/10)۔ خدا نے نیکی اور ثواب کا وعدہ سب سے کیا ہوا ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر صاحب محترم نے جناب افتخار چوہدری صاحب کے خلاف جو الزام لگائے ہیں ان پر صحابہ کرامؓ کی مثال پوری نہیں اترتی۔ صحابہ عظامؓ کے جو اعمال قابل گرفت تھے' جن کا حوالہ ڈاکٹر صاحب نے دیا کہ وہ معاف (Forgiven) کر دیئے گئے وہ اس وجہ سے تھے کہ ان کے سامنے وحی کی تعلیم نہیں تھی۔ وحی آنے کے بعد یا اسلام لانے کے بعد' انہوں نے کوئی غلط عمل نہیں کیا اور اتباع صرف وحی کا کیا' لیکن محترم افتخار چوہدری صاحب کے سامنے تو اس وقت بھی Code of Conduct تھا جب انہوں نے آصف علی زرداری صاحب اور جاوید ہاشمی صاحب کے کیس نہیں سنے اور خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کے کیس کو بھی کسی لائق نہ سمجھا۔ اس لئے ان کا پرویز مشرف کے سامنے ڈٹ جانے سے ان سابقہ اعمال کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ وہ اعمال تو انہوں نے عمداً کئے تھے اور Code of Conduct کو عمداً Ignore کیا۔ ان کے اعمال کا تماثل' صحابہ کرامؓ کے قبل از اسلام اعمال سے نہیں ہوسکتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی کی کتاب

''عقوباتِ قرآن اور مفکرِ قرآن جناب علامہ غلام احمد پرویز'' پر تبصرہ

مجھے درج بالا کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے کہا گیا ہے کہ مصنف کے پیش کردہ دلائل کا علمی جائزہ لیا جائے۔ میں اعتراف کرنا چاہوں گا کہ اس مشق یا مشقت کی ہمت نہیں پا رہا ہوں، لہٰذا علمی حدود کی پابندی کرتے ہوئے سرقہ اور حدِ سرقہ کے موضوع ہی کا جائزہ لے سکوں گا۔ اس کی بحث کا آغاز وہ کتاب کے باب دوم میں قرآن کی درج ذیل آیت سے کرتے ہیں۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُواْ أَيْدِيَهُمَا جَزَاء بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللّهِ وَاللّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ o فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ o (5:38-39).

چوری کرنے والا مرد ہو، یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو، بدلہ ان کی کرتوتوں کا، اور عبرت اللہ کی طرف سے۔ اللہ بڑی قوت والا اور حکمت والا ہے۔ پھر جو شخص ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو بے شک اللہ اس پر مہربانی سے توجہ کرے گا، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں قطع ید سے صرف ہاتھ کاٹنے کے مفہوم سے انحراف کرنے پر محترم پرویز صاحب پر مصنف نے معنوی تحریف کے ارتکاب کا الزام لگاتے ہوئے صفحہ 58-57 میں یوں زور آزمائی کی ہے۔

''قطع ید اور مفکر قرآن'' کی رکیک تاویلات

''جرم سرقہ میں بطور حد، جو سزا خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دی ہے وہ قطع ید ہے جس کا معنی ''ہاتھ کاٹ دینا'' کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ لیکن اس ہاتھ کاٹنے کی ''وحشی سزا'' سے بچ نکلنے کے لئے، نیز مغرب کے اعتراض سے جان چھڑانے کے لئے، رکیک تاویلات کے بہت سے پاپڑ، ہمارے ''مفکر قرآن'' کو بیلنے پڑے ہیں، حالانکہ قطع ید کی ترکیب میں واقع دونوں الفاظ قطع اور ید عام فہم اور معروف الفاظ ہیں۔ عرب ہی نہیں اردو دان حضرات بھی ان دونوں

الفاظ کے مفہوم سے آشنا ہیں۔ اہل پاکستان کو جو ''مفکر قرآن'' نصیب ہوئے ہیں، وہ ''ہاتھ کاٹنے'' کے مفہوم میں، چند الفاظ کا اضافہ کر کے اضافی مفہوم پیدا کرتے ہیں اور پھر خود ہی بڑے ''مفکرانہ انداز'' میں یوں فرماتے ہیں کہ قطع ید سے مراد ہاتھ کاٹ کر الگ پھینک دینا ہی نہیں..... اس کے ساتھ ہی متصل وہ لکھتے ہیں کہ اس کے معنی ہاتھوں کو زخمی کر دینا بھی ہیں (12/31)۔''

سورہ مائدہ کی اسی آیت نمبر 38 کے حوالے سے معنوی تحریف کا محترم پرویز صاحب پر الزام دہراتے ہوئے زیر تبصرہ کتاب کے ص 61 میں فرمایا جا رہا ہے کہ:

''آیت کو تاویل کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے، قطع ید کا دوسرا معنی، (انکال کے مفہوم میں) بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے کسی کام سے روک دینا بھی جیسے قطع لسان کے معنی کسی کو زبان درازی سے روک دینے کے ہوتے ہیں..... قطع ید کا معنی ''روک دینا'' بھی ایک ایسا معنی ہے جسے کارگاہ طلوع اسلام ہی میں گھڑا گیا ہے..... حالانکہ انکال کا معنی ''عبرت ناک'' ''سزا'' ہوتا ہے نہ کہ ''روک''۔

تحریف معنوی کا جرم علمی سطح پر انتہائی گھناؤنا ہوتا ہے، لہٰذا اس کو ثابت کرنے کی ذمہ داری مدعی پر ہوتی ہے۔ مدعی چونکہ مکتبِ ملا کا نمائندہ ہیں، اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ڈیوٹی صرف الزام لگانا ہے اور اس سے بری الذمہ ہونا مدعا علیہ کا سر درد ہے۔ اس لئے قطع ید اور نکال کا محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے ان کی مرتب کردہ ''لغات القرآن'' سے وضاحت کی جا رہی ہے۔

قطع ید کے لغوی مفہوم میں ہم لفظ قطع کے لغوی مفہوم میں لغات القرآن کے صفحہ نمبر 77-1374 میں دیکھتے ہیں کہ:

''**قطع الشیئ** کے معنی ہیں اس چیز کو کاٹ دیا۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے **قطع اللحم**۔ گوشت کاٹنا۔ اور ان چیزوں پر بھی جو معنوی طور پر کٹ جاتی ہیں جیسے **قطع السبیل**۔ ڈاکہ مار کر راستہ کی آمد و رفت کاٹ دینا۔ **قطع لسانہ**۔ کسی پر احسان کر کے اس کی زبان بند کر دینے کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی مثال میں غزوہ حنین کا واقعہ ہے کہ حضورﷺ نے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت عباس بن مرواس کو چالیس اونٹ دیئے۔ وہ بہت غصہ ہوا اور ایک قصیدہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا جاؤ اور جس طرح ہو میری طرف سے اس کی زبان کاٹ لو۔ صحابہؓ گئے اور وہ جتنے میں راضی ہوا اسے دے کر راضی کر لیا۔ یہ تھا مطلب **قطع لسان کا**۔'' (بحوالہ اصح السیر، عبدالروف دانا

پوری' صفحہ 296)۔

سورہ مائدہ میں چوری کی سزا کے متعلق ہے **فاقطعوا ایدیھما** جس کے معنی عام طور پر یہ لئے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ کاٹ کر الگ کر دو۔ لیکن لفظ **قطع** اور **قطع ید** کے مذکورہ صدر معانی کے پیشِ نظر اس کے یہ معانی بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کرو جس سے ان کے ہاتھ چوری سے رک جائیں (چاہے ہاتھ کاٹ کر الگ کر دینے سے یا کسی دوسرے طریق سے)۔

ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں کہ تم نے دستخط کر کے (یا فلاں بات کر کے) اپنے ہاتھ کٹوا دیئے۔ یعنی تم بے بس ہو گئے۔ یا اس کی خلاف ورزی کرنے سے رک گئے۔ اور اگر **قطع ید** سے مراد سچ مچ ہاتھ کاٹ دینے کے ہیں تو یہ وہ انتہائی سزا ہے جو اس وقت دی جا سکے گی جب یہ جرائم ایسے عام ہو جائیں کہ اس قسم کی عبرت انگیز سزا کے سوا ان کی روک تھام کی کوئی اور صورت نہ رہے۔

جب ملک میں نظام خداوندی قائم ہو جائے جس میں ہر فرد کی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کی ذمہ داری خود مملکت پر ہو تو ایسی صورت میں کسی کی چیز چرانا فی الواقعہ ایک سنگین جرم ہو گا جس کی انتہائی سزا دی جانی چاہئے۔ قرآن کریم کا معاشی نظام قائم نہ کرنا اور فاقہ کش چوروں کو **قطع ید** کی سزا دینا' کُل کو چھوڑ کر صرف جزو پر عمل کرنے کے مترادف ہے۔''

اس مفہوم کی مثال میں حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے واقعہ کی مثال آگے چل کر دی جائے گی۔

جہاں تک دوسرے لفظ **یـــد** کے لغوی معنی ہاتھ کے علاوہ بھی اخذ کرنے پر محترم پرویز صاحب کو معتوب کیا جا رہا ہے' اس کے متعلق لغات القرآن کے صفحہ نمبر 1788 میں درج ہے کہ:

''**الیـــد**۔ ہاتھ کو کہتے ہیں۔ مونث استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع **ایـد** ہے۔ ہمارے ہاں اس لفظ کا استعمال متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے' جیسے (قرآن کے الفاظ **یـد اللـہ** کا مطلب لیا جاتا ہے) جاہ اور وقار' قوت و اقتدار۔ غلبہ و تسلط۔ ملکیت۔ مددگار۔ امداد اور فریاد رسی۔ احسان و انعام۔ حفاظت و صیانت۔ حذاقت و مہارت۔''

تیسرے لفظ **انـکـال** کے لغوی مفہوم میں ہم لغات القرآن کے صفحہ نمبر 1664 میں دیکھتے ہیں کہ عبرت کے علاوہ اس کے معنی میں روک دینا بھی شامل ہے۔ **انـکـال** کی جمع **الـنـکـل** کے معنی ہیں مضبوط بھاری سخت بیڑی۔ ایک سخت قسم کی لگام یا لگام کا لوہا۔ اس سے **نـکـلـہ** کے معنی ہیں کسی کو اس روش سے روک دینا جس پر وہ چل رہا ہو۔ **نکل عنہ**۔ اس سے الٹے پاؤں لوٹ جانا۔ **نکل بہ** کے معنی ہیں اسے جرم کی عبرت ناک سزا دی' کیونکہ سزا سے خود مجرم آئندہ کے لئے اس جرم کے ارتکاب سے رک جاتا

ہے اور دوسرے بھی اس سے عبرت پکڑتے ہیں۔ اس مفہوم کے لئے صاحبِ لغات القرآن نے تاج العروس اور ابن فارس کی لغات کے حوالے دیئے ہیں۔

محترم مصنف ڈاکٹر قاسمی صاحب نے اپنی کتاب میں محترم پرویز صاحب کی مرتب کردہ لغات القرآن کے کتاب میں حوالے دیئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ وہ محترم پرویز صاحب پر تحریف معنوی کا الزام دھرتے ہوئے شاید بھول گئے ہیں کہ انہوں نے مذکورہ الفاظ کے یہ معانی اپنی طرف سے گھڑے نہیں بلکہ معانی متعین کرتے ہوئے مستند ترین لغات کی کتابوں کے حوالے بھی شامل کئے ہیں۔ اگر مصنف اتنی بنیادی بات سمجھ پاتے کہ معنوی تحریف کا اعتراض ان مستند ترین لغات پر وارد ہوگا' جس کے حوالوں سے معانی متعین کئے گئے ہیں' تو کم از کم ان کی تنقید میں درشتگی نہ رہتی۔ اور وہ **قطع ید** کے سلسلے میں محترم پرویز صاحب کے دلائل کو رکیک کے نام سے منسوب نہ کرتے۔ ایک جگہ ''**قطع ید**'' کے مفہوم پر یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا کے ضمن میں محترم پرویز صاحب پر تنقید کرتے ہوئے وہ کتاب کے صفحہ نمبر 68 میں فرماتے ہیں کہ:

''**قطع ید** کی رکیک تاویلات میں اس کا معنی یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ: اگر **ایدی** کے معنی اختیار اور مقدرت لئے جائیں (لغات القرآن' صفحہ 1376) تو **قطع ید** کے معنی ہوں گے ان اختیارات کا سلب کر لینا یا اس مقدرت کا چھین لینا جس کی رو سے انسان چوری کرتا ہے..... صرف اس سوال پر غور کیجئے کہ اگر چور ہو ہی بے اختیار تو آپ اس کے کون سے اختیارات سلب کریں گے؟ اور اگر اس کی مقدرت ہی کو چھین لینا مقصود ہو تو پھر ہاتھ کاٹ ڈالنے سے بہتر اور کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟''

الید کے تحت لغات القرآن سے متعدد معنی متعین کئے گئے ہیں' جن میں کسی بھی شق میں اختیار اور مقدرت سلب کرنے کے معنی بیان نہیں کئے گئے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے محترم پرویز صاحب کے قطع ید کے مفہوم' چور کو آئندہ جرمِ سرقہ سے روکنے' کو مضحکہ خیز ثابت کرنے کے لئے اپنی خود ساختہ نرالی منطق سے استنباط کیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی مقدرت (خدا کی طرف سے ودیعت کردہ ارادہِ و اختیار میں آزادی کی قوت) چھین لینا مقصود ہے۔

چور کو آئندہ جرم سرقہ کے محرکات سے روکنا' اس سے بہت مختلف بات ہے کہ کسی فرد کو اس کے اختیار و ارادہ کی آزادی سلب کر کے اسے مجبور بنا دیا جائے۔ اس سے پیشتر کہ ہم آگے بڑھیں' مناسب ہوگا کہ بحث طلب سورہ مائدہ کی آیات 5:38-39 کا مفہوم (Para phrasing) محترم پرویز صاحب کے ''مفہوم القرآن''

سے سامنے لایا جائے۔

''ملک میں بغاوت پھیلانے اور فساد برپا کرنے کے بعد' بڑا فتنہ' چوری کا جرم ہے جس سے معاشرہ میں امن اور سکون باقی نہیں رہتا۔۔۔ چور' مرد ہو یا عورت' مجرم ہونے کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ اس لئے ان کی سزا میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اس کے لئے ایسا طریق اختیار کرنا چاہئے جس سے خود چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں' اور وہ دوسروں کے لئے بھی' قانونِ خداوندی کی رو سے روک بن جائے۔ یعنی وہ مجرم کے لئے' موجبِ اصلاح (Curative) ہو اور دوسروں کے لئے جرم سے اجتناب کا باعث (Preventive) لیکن اگر یہ دیکھو کہ پانی سر سے گذر چکا ہے اور یہ جرم عام ہو رہا ہے' تو اس کی انتہائی سزا یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ بہرحال' مقصد اس جرم کی روک تھام ہے۔۔۔ خواہ غلبہ اور قوت سے ہو' خواہ حُسن تدبیر سے۔ (عزیز حکیم میں دونوں باتیں آ جاتی ہیں)۔''

''مقصد چونکہ جُرم کی روک تھام ہے' اس لئے جو شخص ارتکابِ جُرم کے بعد' اپنے کئے پر نادم ہو' اور اپنی اصلاح کر لینے کا یقین دلائے' تو قانونِ خداوندی میں اس کے لئے معافی کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ ایسے شخص کو سزا سے بھی محفوظ رکھا جائے گا اور عام سہولتوں سے بھی محروم نہیں کیا جائے گا۔'' (مفہوم القرآن' 39-5:38)۔

اس کی تنقید میں جناب مصنف نے کتاب کے صفحہ 68 میں محترم پرویز صاحب کے اس موقف کو کڑے ہاتھوں لیا ہے کہ:

''اگر یہ دیکھو کہ پانی سے سے گذر چکا ہے اور یہ جرم ہو رہا ہے تو اس کی انتہائی سزا یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔''

اس کے جواب میں مصنف نے کتاب کے صفحہ 69 میں وضاحت کی ہے کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ قطع ید کا ایک ہی مفہوم ہے ''ہاتھ کاٹ ڈالنا'' اور یہی سرقہ کی وہ واحد سزا ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے زمانہ میں یہی سزا سارقین کو دی ہے۔ کتب احادیث میں بیسیوں واقعات' اس پر بطور شہادت پیش کئے جاسکتے ہیں۔''

سرقہ کے جرم کی بطور واحد سزا (ہاتھ کاٹ ڈالنا) کے ثبوت میں وہ حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ اور اس سے منطقی طور پر مضحکہ خیز نتیجہ نکالتے ہوئے صفحہ 72 میں یوں فرماتے ہیں کہ:

''اس سلسلہ میں حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کا

واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ایک شخص کا اونٹ چرا کر ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ آپ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا ''حاطب ہم سے کام تو سخت لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

یہ سن کر آپ نے غلاموں کو تو معاف کر دیا اور حاطب کو بلا کر کہا کہ ''چاہئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا میں تمہارا ہاتھ کٹوا دیا جائے کہ اس جرم کے مرتکب تمہارے غلام نہیں، تم ہو، جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو، اگر آئندہ تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔''

یہ واقعہ (مصنف کی نظر میں) اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ:

(1) خلافتِ راشدہ میں بھی ''چوری کی سزا'' ''ہاتھ کاٹ دینا'' ہی تھی۔ اگر یہ سزا نہ ہوتی تو حضرت عمرؓ حاطب کو ''ہاتھ کاٹ دینے'' کی دھمکی نہ دیتے۔

(2) سزا دیتے وقت یہ قطعاً نہیں دیکھا جاتا تھا کہ مرتکب سرقہ، عادی چور ہے یا غیر عادی۔

(3) ہاتھ کاٹ دینا ہی وہ سزائے واحد تھی جو سارقین کو دی جاتی تھی بغیر اس جھمیلے میں پڑنے کے، کہ یہ انتہائی سزا ہے یا مطلق سزا۔

اس واقعہ پر سرسری غور کرنے سے ہی قارئین کے لئے اندازہ لگانا مشکل نہ ہو گا کہ مصنف نے جو اس واقعہ سے نتائج اخذ کئے ہیں، حقیقت میں یہ واقعہ ان نتائج کی نفی کر رہا ہے۔ اس کے برعکس جس موقف کے ابطال کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے، یہ واقعہ اس موقف کی تائید کر رہا ہے، اس لئے کہ:

(1) علمی میدان میں سزا سے مراد وہی سزا ہوتی ہے جو عملی طور پر دی جائے نہ کہ جس کی دھمکی دی جائے۔ یہاں ہاتھ کاٹنے کی جگہ دیگر سزا اونٹ کی قیمت ادا کرنے کے جرمانہ کی صورت میں دی گئی۔ لہٰذا اس واقعہ سے کسی بھی طرح اور علمی سطح پر کہیں سے بھی سند نہ پانے کی صورت میں اس سزا کو صرف اور صرف ہاتھ کاٹنے کی تائید کے موقف میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

(2) اس واقعہ سے مصنف کا دوسرا موقف بیان کیا گیا ہے کہ سزا دیتے وقت یہ قطعاً نہیں دیکھا جاتا تھا کہ مرتکب سرقہ، عادی چور ہے یا غیر عادی۔ اس کے برعکس اس واقعہ میں حضرت عمرؓ سے بالتصریح وضاحت ہوتی ہے کہ جرم کے

آئندہ اعادہ سے مجرم موجودہ سزا سے زیادہ سخت سزا کے حقدار ہونے کے متعلق سوچے جانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ اس واقعہ میں درج یہ وضاحت مصنف کے موقف کی تائید کی جگہ نفی کررہی ہے۔

(3) تیسرے موقف میں مصنف نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہاتھ کاٹ دینا مرتکب سرقہ کے لئے انتہائی سزا نہیں بلکہ واحد سزا ہی تھی۔ اس کے برعکس سزا دیتے وقت حضرت عمرؓ کی زبان سے کہلوایا گیا کہ وہ جرم سرقہ میں ''نرمی'' برتتے ہوئے اونٹ کی قیمت کے برابر جرمانہ عائد کرتے ہیں۔ لہٰذا یہاں بھی مصنف کے موقف کی تائید کی بجائے نفی ہورہی ہے۔

اس غیر علمی، غیر منطقی اور غیر تحقیقی انداز پر مبنی دلائل کے زور پر مصنف شکوہ کرتے ہیں کہ ان جیسے ''ماہر پرویزیات'' کے دلائل کا جواب دینے کی طلوع اسلام کو جرأت نہیں ہوئی۔

میرے اس تبصرہ کے فریضہ کا مقصد یہی ہے کہ مصنف کے علم میں لایا جائے کہ طلوع اسلام کی پالیسی یہی رہی ہے کہ وہ لغو یعنی مہمل اور بے معنی بحث میں نہیں الجھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ قرآن سے ہدایت حاصل کرتے ہیں کہ مومنین کا وصف ہے کہ وہ:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (23:3)۔

وہ لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔

مزید یہ بھی کہ:

وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَاماً (25:72)۔

اگر انہیں کہیں لغو کے پاس سے گذرنا پڑے تو وہ نہایت شریفانہ انداز سے گذر جاتے ہیں۔

اس لئے طلوع اسلام کی طرف سے مصنف کو جواب میں صرف قرآن میں بیان کی گئی راہنمائی کی طرف توجہ دلانا ہی مقصود ہے کہ:

وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (22:30)۔

ہر اس نظریہ سے بچو جو صحیح راستے سے ہٹا کر، کسی دوسری طرف لے جانے کا موجب ہو۔

یعنی مکر وفریب، تصنع اور بناوٹ، چال بازی، فریب کاری اور بے انصافی کی باتیں کبھی نہ کرو۔

سرقہ کی واحد سزا ''ہاتھ کاٹ ڈالنا'' اور قتل مرتد کے موقف کے ثبوت میں روایات کو لاکر فتویٰ دیتے ہیں کہ حکم روایات اور فقہ کا مانا جائے۔ اس ضمن میں زیر تبصرہ کتاب کے ص196 میں درج یہ عبارت ملتی ہے کہ:

'' 'مفکر قرآن' اس بات کے خلاف ہیں کہ سنت کو قرآن پر حاکم وقاضی بنایا جائے' امام اوزاعیؒ نے ایک مقام پر درست بات کہی تھی کہ الکتاب احوج الی السنة من السنة الی

الـکتـاب ۔ (جامع بیان العلم وفضلہ لا بن عبدالبرؒ ج 2 ' صفحہ 191)۔

کتاب اللہ' سنت رسول کی زیادہ محتاج ہے' بہ نسبت اس کے کہ سنتِ نبیؐ قرآن کی محتاج ہو۔

لہٰذا عقیدہ یہ ٹھہرا کہ:

(1) حدیث' قرآن کی اتنی محتاج نہیں' جتنا قرآن' حدیث کا محتاج ہے۔

(2) حدیث' قرآن پر قاضی ہے۔

اس عقیدہ سے انکار کر کے ''منکر قرآن'' یہ چاہتے ہیں کہ ''حدیث تو قرآن پر قاضی نہ ہو'' مگر ان کی ''بصیرت'' قرآن پر حاکم وقاضی ضرور رہے' وہ اگر ''زائد از قرآن'' کسی چیز کو ''خلاف قرآن'' قرار دے دیں' تو لازم ہے کہ ساری مخلوق' اسے ایسا ہی مان لے''۔

اس ضمن میں وضاحت مقصود ہے کہ محترم پرویز صاحب جب بھی قرآن کے حوالہ سے بات کی ہے' تو اس کی تائید میں علمی دلائل مستند حوالوں سے پیش کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔

ان کا واضح موقف ہے کہ احادیث یا کوئی بھی علم اور کسی کی رائے قرآن پر قاضی نہیں ہے۔ احادیث کے متعلق وہ صرف ایک ہی معیار ان کے پرکھنے کا دیتے ہیں کہ صحاح ستہ یا کسی بھی کتاب میں درج احادیث فرمان رسولﷺ کا درجہ نہیں رکھتیں جب تک کہ وہ خلاف قرآن نہ ہونے کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکیں۔ وہ رسول اکرمﷺ کی طرف منسوب ضرور ہیں' لیکن قرآن کی روشنی میں اگر وہ قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کے خلاف جائیں' تو وہ رسول کا فرمان کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتیں۔ رسول اکرمﷺ کی اتھارٹی نہ ماننے کے لئے ''زائد از قرآن'' کا تصور خود مصنف کے دماغ کی اختراع ہے' ورنہ محترم پرویز صاحب کے لئے وہ قرآن کی کسوٹی پر پورا اترتے ہوئے' دین میں سند کا درجہ رکھتے ہوئے مطلق اتھارٹی کا استحقاق رکھتی ہے۔ ہم یہاں محترم پرویز صاحب کا اس ضمن میں موقف سامنے لا رہے ہیں' جو انہوں نے آغاز سے ہی متعین کر رکھا ہے اور جسے آج بھی طلوع اسلام کے سرِ ورق پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

☆ نبی اکرمﷺ کی سیرت مقدسہ' شرف وعظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت

مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

☆ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چاردیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

☆ بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور' دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

☆ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلندترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

محترم پرویز صاحب نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ:

> جب تک وہ نظام (خلافت علیٰ منہاج نبوت) قائم نہ ہو ہم کیا کریں۔ اس سلسلہ میں میرا نظریہ اور مسلک یہ ہے کہ مختلف فرقے جس جس طریق سے ارکان اسلام کی پابندی کرتے چلے آ رہے ہیں' ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ نہ ان میں کوئی تبدیلی تجویز کی جائے اور نہ کوئی نیا طریقہ وضع کیا جائے۔ ایسا کرنے سے بجز اس کے کہ امت میں مزید انتشار پیدا ہو کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے' اس قسم کا اختیار صرف اسلامی نظام کو حاصل ہے' کسی فرد یا فرقے کو حاصل نہیں۔ اپنے اس نظریہ کے مطابق میں خود

بھی ارکانِ اسلام کی پابندی دوسرے مسلمانوں کی طرح کرتا ہوں اور جو لوگ میری بات سنتے ہیں' ان سے بھی یہی تاکید کرتا ہوں کہ وہ ان کی پابندی اسی طریق سے کرتے چلے جائیں۔ البتہ جو عقائد یا شعائرِ قرآن کے خلاف نظر آئیں ان کی نشاندہی کی جائے اور ان کی جگہ قرآن کی صحیح تعلیم کو عام کیا جائے۔ میں قریب چالیس سال سے یہی کچھ کرتا چلا آ رہا ہوں اور یہی تحریکِ طلوع اسلام کا مقصود و منتہیٰ ہے۔

ایک ہی معیار خلافِ قرآن نہ ہونے کے بالمقابل فاضل مصنف سے بہتر کون جانتا ہے کہ مستند اصولین نے روایتی معیار کے ساتھ ساتھ درج ذیل درایتی معیار بھی احادیث کی پرکھ کے لئے متعین کیا ہے' جس کا خلاصہ ایم۔فل (اسلامیات) علامہ اقبال یونیورسٹی کے مطالعاتی رہنما بعنوان اسلام میں تحقیق کے اصول و مبادی کے صفحہ 42 سے لے کر درج کیا جا رہا ہے۔

''درایت کی ابتدا عہد صحابہؓ سے ہو چکی تھی اور ذخیرہ احادیث میں بعض صحابہؓ سے متعدد ایسی روایات ہیں جنہیں دوسرے صحابہؓ نے درایت کی بنا پر صحیح تسلیم نہیں کیا۔ محدثین نے اصول روایت کی طرح اصول درایت بھی متعین کئے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

ایسی روایت قبول نہیں کی جائے گی:

(1) جس میں لفظی و معنوی رکاکت پائی جائے یعنی الفاظ اور جملوں کے اعتبار سے گری ہوئی ہو۔

(2) خلافِ عقل ہو۔

(3) مسلمہ اصولوں کے خلاف ہو۔

(4) محسوسات اور مشاہدے کے خلاف ہو۔

(5) قرآن حکیم کے خلاف ہو۔

(6) حدیثِ متواتر کے خلاف ہو۔

(7) اجماع قطعی کے خلاف ہو۔

(8) معمولی بات پر سخت عذاب کا وعدہ ہو۔

(9) معمولی کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

(10) ایسی روایت ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونا چاہئے لیکن ایک آدمی کے سوا اسے کوئی روایت نہ کرتا ہو۔

(11) کسی ایسی پیشین گوئی سے متعلق ہو جو مہینے اور سال کے تعین کے ساتھ ہو مثلاً دنیا کی عمر سات ہزار سال ہوگی وغیرہ۔

(12) کسی ایسے واقعے سے متعلق ہو اگر وہ وقوع میں آتا تو اس کے سینکڑوں راوی ہوتے لیکن صرف ایک آدمی اس کو روایت کر رہا ہو۔

اصولین و محدثین نے احادیث کے مجموعے میں محنت سے کام لیتے ہوئے اس کی صحیح یا ضعیف ہونے کی پرکھ میں سخت

درایتی معیار متعین کیا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کے نصاب کی رو سے اس کڑے معیار کی شرائط کو پورا کرتے ہوئے صحاح ستہ کے مجموعہ کے متعلق ڈاکٹر محمود احمد غازی نے محاضراتِ حدیث کے صفحات 127 ,131 اور 174 میں یوں دعویٰ کیا ہے:

(1) صحیح بخاری کے اندر کوئی ضعیف حدیث موجود نہیں ہے۔ محدثین کے معیارات کی رو سے اس کی تمام احادیث صحیح احادیث ہیں (صفحہ 127)۔

(2) موطا امام مالک میں جو مرفوع احادیث آئی ہیں' وہ ساری کی ساری صحیح بخاری اور مسلم میں آ گئیں' اس لئے جب صحیح بخاری اور مسلم کو صحیحین قرار دیا گیا تو امام مالکؒ کی موطا کی احادیث خود بخود صحاح میں شامل ہو گئیں۔ (صفحہ 131)۔

(3) یہ جو حدیث صحیح کے اتنے مشکل معیارات بیان ہوئے' صحاح ستہ کی ساری کتابوں میں ساری احادیث انہی معیارات پر ہیں اور وہ بیشتر صحیح ہیں اور اگر صحیح نہیں تو حسن ہیں اور حسن بھی قابلِ قبول ہیں۔

محترم پرویز صاحب کے موقف کی تائید میں ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے محدثین کے معیارات پر صحاح ستہ کے مجموعات کے مرتب ہونے کے دعویٰ کو نظر انداز کرتے ہوئے تفہیمات حصہ اول کے عنوان مسلکِ اعتدال کے تحت صفحہ 348 میں یوں فرماتے ہیں کہ:

''ہم نے کبھی اس خیال کی تائید نہیں کی کہ ہر شخص کو ائمہ حدیث کی اندھی تقلید کرنی چاہئے یا ان کو غلطی سے مبرا سمجھنا چاہئے۔ نہ کبھی ہم نے یہ دعویٰ کیا کہ ہر کتاب میں جو روایت قال رسول اللہ سے شروع ہو' اس کو آنکھیں بند کر کے رسول اکرم ﷺ کی حدیث مان لیا جائے۔ برعکس اس کے ہمارے نزدیک کسی حدیث کو حدیثِ رسول قرار دینے کی ایک گراں بار ذمہ داری ہے جس کو اٹھانے کی جرأت کافی تحقیق کے بغیر ہرگز نہ کرنی چاہئے اور تحقیق و اجتہاد کے متعلق بھی ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کا دروازہ ہر زمانہ میں کھلا ہوا ہے اور کسی خاص عہد کے لئے مخصوص نہیں ہے۔''

اسی تحقیق و اجتہاد کا ہر زمانہ میں دروازہ کھلا ہونے کی روشنی میں محترم پرویز صاحب نے اصولیین کے متعدد معیارات کے بالمقابل صرف ایک معیار یعنی قرآن کے اصولوں کے خلاف نہ ہونے کی بنا پر روایات احادیث کا نقد کیا ہے۔ مصنف محترم پرویز صاحب پر یہ الزام لگانے میں حق بجانب ہوسکتا ہے کہ انہوں نے روایتی تساہل اور نرمی سے کام لینے کی بجائے' اپنی تحقیق میں سخت اور بے لچک رویہ اپناتے ہوئے روایتی مسلمات کو درست ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

ہمارے مذہبی اکابرین علمی تنقید کو تہذیبِ مغرب سے منسوب کر کے اسے رد کر دیتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے

یہ قابل مصنف محترم پرویز صاحب کو مفکر قرآن کا خطاب دے کر کتاب کے صفحہ 177 میں محترم پرویز صاحب کے دلائل یوں رد کر رہے ہیں کہ:

''ہمارے ''مفکر قرآن'' جیسے لوگ صرف نظریئے کی حد تک نہیں' بلکہ مدنیت و معاشرت کا وہ پورا نقشہ' قرآن کے جعلی پرمٹ پہ درآمد کر رہے ہیں' جو تہذیب مغرب کا تشکیل کردہ ہے۔''

مصنف شاید محترم پرویز صاحب کے مغربی تہذیب کی تنقید کے مواد کا مطالعہ نہیں کر سکے۔ لہٰذا یہاں ہم ان کا مختصر سا جائزہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہیں گے جو انہوں نے متعدد مرتبہ تین انسانی گروہوں میں تقابلی جائزہ لے کر پیش کیا ہے۔

(1) پہلے گروہ میں جو قومیں سمع و بصر و فؤاد سے کام لے کر تسخیر فطرت کرتی ہیں اور پھر فطرت کی قوتوں کو قوانین خداوندی (قرآن) کے مطابق صرف کرتی ہیں' وہ مومن و متقی ہیں۔ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشندہ و تابناک ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی خوشگوار و شاداب۔ عصر حاضر میں تو کوئی قوم بھی اس گروہ میں شامل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی البتہ تاریخ میں رسول اکرم ﷺ اور خلافت کا زمانہ اسی گروہ کے نمائندہ کی حیثیت سے متعارف ہوسکتا ہے۔

(2) دوسرے گروہ میں وہ قومیں جو تسخیر فطرت تو کرتی ہیں لیکن قرآن کی مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتیں۔ وہ صرف مقام آدمیت تک پہنچتی ہیں' مومن اور متقی کے مقام تک نہیں پہنچتیں۔ وہ اس دنیا کی زندگی میں قوت و شوکت حاصل کر لیتی ہیں' لیکن مستقبل ان کا تاریک ہوتا ہے۔ اس دنیا میں مستقبل بھی اور آخرت کی زندگی بھی۔ عصرِ حاضر میں اس گروہ میں اقوام مغرب کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

(3) تیسرے گروہ میں وہ قومیں جو سرے سے تسخیر فطرت کرتی ہی نہیں وہ مومن و متقی ہونا تو کجا مقام آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ ان کے لئے اس دنیا میں بھی ذلت و خواری ہے اور آخرت میں بھی تباہی و بربادی۔ عصر حاضر میں بدقسمتی سے بالعموم مسلم ممالک ہی اس گروہ میں شامل ہونے کے اہل ہیں۔

محترم پرویز یا علامہ اقبال جیسے ہمارے مفکرین کا مطمح نظر' پہلا گروہ مومن و متقی میں شمولیت کے حصول کی تلقین ہوتا ہے۔ اس ضمن میں وہ دوسرے گروہ میں شامل مقام آدمیت کے اقوامِ فرنگ کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنی روش میں تبدیلی لاتے ہوئے' پہلے گروہ میں شامل ہونے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف رہیں۔ امن و سلامتی کا یہی اور صرف یہی راستہ ہے۔ تیسرے گروہ میں شامل بالعموم مسلم ممالک اور بالخصوص پاکستان کے افراد کو ان کی تلقین ہوتی ہے کہ وہ پہلے گروہ میں شامل ہونے کے لئے اہلیت حاصل کرنے کے لئے اقوامِ مغرب کے دوسرے گروہ کی

خصوصیت تسخیرِ فطرت کے لئے علوم سے آ گاہی حاصل کریں تا کہ گروہ اول میں شامل ہوسکیں۔تبدیلی کی خواہش کا اظہار دونوں محترم پرویز صاحب اور علامہ اقبال تمام عمر دونوں مسلم ممالک اور مغربی اقوام سے کرتے رہے۔اسی لئے ان دونوں کو شکایت ہی رہی کہ ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

اس شکایت کی وجہ بھی علامہ اقبالؒ نے ڈھونڈ نکالی ہے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے' ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاھل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل، کراچی
asif.jalil1@gmail.com

حضرت انسان قرآن کے آئینے میں

(قسط ۷)

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُھْدَھُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْھُمْ سَخِرَ اللّٰہُ مِنْھُم وَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (9:79)۔

جولوگ ان مسلمانوں پر طعنہ زنی کرتے ہیں جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جنہیں سوائے اپنی محنت مزدوری کے اور کچھ میسر ہی نہیں، پس یہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، اللہ بھی ان سے تمسخر کرتا ہے۔ انہی کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہاں پر بعض لوگوں کی عادت بتائی گئی ہے کہ وہ ہر کسی کی عیب جوئی کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اچھے کام کرنے والوں کو بھی نہیں بخشتے اور محنت کشوں کی بھی تحقیر کرتے ہیں۔ اپنے خود ساختہ عزت کے معیار بنائے بیٹھے ہیں جن کے مطابق دولت مند کو عزت دی جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ اس کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ اور ذہنیتوں کی طرح اکثریت ایسے لوگوں ہی کی ہے۔

وَ اِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَۃٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ جَاھِدُوْا مَعَ رَسُوْلِہِ اسْتَاْذَنَکَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْھُمْ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَکُنْ مَّعَ الْقٰعِدِیْنَ (9:86)۔

جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ان میں سے دولت مندوں کا ایک طبقہ آپ کے پاس آ کر یہ کہہ کر رخصت لے لیتا ہے کہ ہمیں تو بیٹھے رہنے والوں میں ہی چھوڑ دیجئے۔

اس آیت میں دولت مندوں اور مذہبی پیشواؤں کی ذہنیت کی صحیح طور پر عکاسی کی گئی ہے کہ وہ کوئی تکلیف نہیں اٹھانا چاہتے نہ کسی مشقت کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ دولت مند جہاد (مروجہ معنوں میں) کی خاطر اپنا پیسا تو دے دیتے ہیں (ثواب کی خاطر) لیکن عملاً اس سے دور رہتے ہیں۔ اسی

طرح مذہبی رہنما (جو معاشی طور پر مرفہ الحال ہوتے ہیں) لوگوں کو جن اعمال کے لئے وعظ ونصیحت کرتے ہیں عملی طور پر ان میں حصہ نہیں لیتے۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ. ۪ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (10:12)۔

اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے اپنی تکلیف کے لیے جو اسے پہنچی تھی کبھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ ان حد سے گزرنے والوں کے اعمال کو ان کے لیے اسی طرح خوشنما بنا دیا گیا ہے۔

یہ ذہنیت تو اتنی عام ہے کہ اس بارے میں مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہر روز ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ البتہ یہ بات افسوسناک ہے کہ لوگ اپنی مشکلات کے اسباب جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو کتاب ان کے جملہ مسائل کا حل پیش کرتی ہے اسے بغیر سمجھے پڑھتے ہیں۔ لہذا عمل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری طرف مذہبی رہنماؤں نے انہیں اللہ کا تصور کچھ اس طرح کا ذہن نشین کرا رکھا ہے کہ محض یا اللہ یہ کر دے اور وہ کر دے کہنے (خود کچھ نہ کرنے) سے ان کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (10:15)۔

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کی امید نہیں ہے یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کر دیجئے۔ آپ (ﷺ) یوں کہہ دیجئے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں۔ بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ قرآن کریم کے احکام کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے اور بہانے بناتے ہیں۔ حضور ﷺ

کے مخاطبین تو کہتے تھے کہ کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسے بدل دو لیکن آج کے مذہبی پیشواؤں نے اس کا حل یہ نکال لیا ہے کہ روایات اور داستانوں کو قرآن کریم پر فوقیت دے رکھی ہے اور عملاً قرآن کریم کے احکام کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ یہاں پر روایات کو پرکھنے کا ابدی اصول بھی دیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ بھی وحی یعنی قرآن کریم پر عمل کرتے تھے لہٰذا کسی بھی غیر قرآنی عمل کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْ م بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (10:21)۔

اور جب ہم لوگوں کو اس امر کے بعد کہ ان پر کوئی مصیبت پڑ چکی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ فوراً ہی ہماری آیتوں کے بارے میں چالیں چلنے لگتے ہیں' آپ کہہ دیجئے کہ اللہ چال چلنے میں تم سے زیادہ تیز ہے' بالیقین ہمارے فرشتے تمہاری سب چالوں کو لکھ رہے ہیں۔

اس ذہنیت کا تجربہ بھی ہر کسی کو ہوا ہوگا۔ لوگوں کے حالات بدلنے سے ان کے رویے بھی بدل جاتے ہیں۔ وہ اپنا ماضی بھول جاتے ہیں کہ کل تک ان کی حالت کیا تھی۔ وہ اللہ کے احکام کے بارے میں لیت ولعل سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ ان کا ان احکام پر ایمان پختہ نہیں ہوتا۔ لیکن ان کے اعمال کے اثرات ان کی ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔

وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ o وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ (11:9-10)۔

اگر ہم انسان کو اپنی کسی نعمت کا ذائقہ چکھا کر پھر اسے اس سے لے لیں تو وہ بہت ہی ناامید اور بڑا ہی ناشکرا بن جاتا ہے۔ اور اگر ہم اسے کوئی نعمت چکھائیں اس سختی کے بعد جو اسے پہنچ چکی تھی تو وہ کہنے لگتا ہے کہ بس برائیاں مجھ سے جاتی رہیں' یقیناً وہ بڑا ہی اترانے والا شیخی خور ہے۔

یہ بھی سابقہ آیت کی طرح اس رویے کی عکاسی کرتی ہے جس سے سب واقف ہیں۔ یہاں یہ اضافہ ہے کہ حالات بہتر ہو جانے کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ اللہ کے احکام کو بھول جاتا ہے بلکہ وہ اسے اپنا کمال سمجھتا ہے اور غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ

اِلَّا الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَ مَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ (11:27)۔

اس کی قوم کے کافروں کے سرداروں نے جواب دیا کہ ہم تو تجھے اپنے جیسا انسان ہی دیکھتے ہیں اور تیرے تابعداروں کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ واضح طور پر سوائے نیچ لوگوں کے اور کوئی نہیں جو بے سوچے سمجھے (تمہاری پیروی کر رہے ہیں) ہم تو تمہاری کسی قسم کی برتری اپنے اوپر نہیں دیکھ رہے' بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔

یہاں لیڈروں کی ذہنیت کے بارے میں بتایا گیا ہے جو اپنی دولت اور خود ساختہ عزت کی وجہ سے بڑے بن جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عام لوگ نیچ ہوتے ہیں اور بے وقوف بھی۔ وہ مخالفت کی دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ یہ سبب بھی بیان کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنا رسول بناتا ہے ان کا تعلق ان سرداروں اور لیڈروں کے طبقے سے نہیں ہوتا بلکہ وہ عام انسان ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو ہر انسان کو واجب تکریم قرار دیا ہے اور اس کے نزدیک اچھا ہونے کا معیار تقویٰ ہے لیکن ان سرداروں کو یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ آج بھی یہی ذہنیت ہمارے سیاسی لیڈروں کی ہے۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰہُ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُہٗ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ (11:35)۔

کیا یہ کہتے ہیں کہ اسے خود اسی نے گھڑ لیا ہے؟ تو جواب دے کہ اگر میں نے اسے گھڑ لیا ہو تو میرا گناہ مجھ پر ہے اور میں ان گناہوں سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو۔

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر انسان اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ لہٰذا دوسروں کو الزام دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے اپنے عمل کو دیکھنا چاہیے کہ اللہ کی ہدایت کے مطابق ہے یا نہیں۔ دور اول کے کافر تو سرے سے مانتے ہی نہیں تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور نبی کریم ﷺ پر الزام تراشی کرتے تھے کہ یہ انہوں نے خود گھڑ لیا ہے (نعوذ باللہ)۔ آج یہ حال ہے کہ کوئی صرف اور صرف قرآن کریم کو معیار ماننے اور اس کے مطابق عمل کرنے کو تیار نہیں۔ اس کے بجائے ہر کوئی اپنے اپنے مسلک کا پیروکار ہے۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَہُ کَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْنَا ضَعِیْفًا وَ لَوْ لَا رَھْطُکَ لَرَجَمْنٰکَ وَ مَآ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ (11:91)۔

انہوں نے کہا اے شعیب تیری اکثر باتیں تو ہماری

سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم تو تجھے اپنے اندر بہت کمزور پاتے ہیں' اگر تیرے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تو تجھے سنگسار کر دیتے اور ہم تجھے کوئی حیثیت والی ہستی نہیں گنتے۔

یہاں یہ ذہنیت سامنے آتی ہے کہ انسان جس نظریے پر قائم ہوتا ہے اس کے سوا وہ کوئی بات سننا اور سمجھنا نہیں چاہتا اور کہتا یہ ہے مجھے تمہاری بات سمجھ میں نہیں آتی۔ دوسری بات یہاں یہ ہے کہ کمزور شخص کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی البتہ اگر اس کا کوئی گروہ ہو تو اس کا ڈر ضرور ہوتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں ہمارے معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات سے ملتی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی، کراچی

قرآنی الفاظ کے مذہبی اور دینی مفاہیم

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے جاری کردہ نظام کا نام دین ہے۔قرآنِ کریم کے الفاظ واصطلاحات کا مرکزی محور دین ہے اور دین کے عملی نفاذ کے گرد ہی اس کے الفاظ گردش کرتے ہیں۔ جب دین نے مذہب کی شکل اختیار کر لی تو قرآنِ کریم کے الفاظ و اصطلاحات کے معانی ہی بدل گئے۔اب ان الفاظ کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا بلکہ ان کو ایک مذہبی تقدس (Sanctity) حاصل ہوگیا اور ان تمام الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم ومنطوق پرستش و پوجا کے لئے مختص ہوگیا۔خود قرآنِ کریم کو ایک قانون اور دستور حیات خیال کرنے کے بجائے صرف تلاوت اور ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دے دیا گیا۔اس کو پڑھنے کے لئے پہلے وضو کرنا مستحب قرار دیا گیا۔ حالانکہ ایک ایسا ضابطۂ حیات جس کو ہر وقت سامنے رکھنا ہو اور ہر قانون دان، وکیل، بیرسٹر، سینیٹر، جج، کے پاس ہر وقت موجود ہو، ان سب کو ہر وقت باوضو رہنا مشکل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم پرستش کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ پرستش مذہب میں ہوتی ہے۔ دین میں عملاً اس ضابطۂ حیات کی اجتماعی طور پر اطاعت ہوتی ہے اور یہی اطاعت عبادت خداوندی ہے۔

ہمارے ہاں مذہب میں ان الفاظ کے مفاہیم کو اس درجہ تبدیل کر دیا گیا ہے کہ ان کا دینی مفہوم اب بالکل مخفی ہوگیا ہے۔ یہ تمام الفاظ اطاعت کے بجائے پرستش کے گرد گردش کرنے لگے۔ان میں سے ایک ایک لفظ، اطاعت کی تردید اور پرستش کی حمایت میں استعمال کیا جانے لگا۔ ہمارے ہاں یہ سلسلہ ایک ہزار سال سے چلا آ رہا ہے اور ہمارا سارا لٹریچر خصوصاً تفاسیر واحادیث پرستش کے نقطۂ نگاہ سے ہی تحریر کی گئی ہیں۔فرقہ اہل قرآن کے طبقۂ اولیٰ کے سامنے بھی دین کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ بھی فقہ کو قرآن کے مطابق کرنے، اور وحی خفی کی تردید کرنے میں ہی اپنی کوششیں صرف کرتے رہے۔ وہ مذہب کی سطح تک ہی

رہے۔ دین کی بلند سطح تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ یہ مجد اور شرف تحریک طلوع اسلام کے حصہ میں آیا کہ اس تحریک نے قرآن کریم کو دین کی حیثیت سے پیش کیا۔ ہمارے ایک ہزار سال کے لٹریچر میں یہ پہلی کوشش ہے کہ اسلام کو دین کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس تحریک کے بانی اور داعی قرآن و اسلام' علیہ اَلفَ الف تحیتہً وسلام' کو اللہ تعالیٰ اعلیٰ درجات عنایت فرمائے کہ ان کی قرآنی بصیرت نے مذہب اور دین کے امتیاز کو نہ صرف Detect کیا بلکہ اس امتیاز کو خوب خوب واضح طور پر پیش کیا۔ ان کی ساری عمر کی مساعی جمیلہ اسلام کو بحیثیت نظام اور دستور حیات ثابت کرنے پر ہی مرتکز رہیں۔

ایک ہزار سالہ تاریک دور کے بعد قرآن کریم کے الفاظ کو خالص دینی مفہوم میں پیش کرنا' کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام بہت ژرف نگاہی کا متقاضی ہے۔ کیونکہ سابقہ تمام تفاسیر میں اس بارے میں نہ تو کوئی روشنی ملتی ہے اور نہ ہی کوئی راہنمائی۔ اس بارے میں ایران کے اسلامی انقلاب کے ساتھ بہت امیدیں و توقعات وابستہ تھیں۔ وہاں کے علماء کرام کا مبلغ علم بھی بہت بلند مرتبہ ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی (Privilege) یہ ہے کہ وہ علماء کرام موجودہ علوم اور مغربی زبانوں سے بھی خوب واقف ہیں اور چونکہ انہوں نے اسلامی انقلاب برپا کرنے میں سخت جدوجہد کرنے کے علاوہ بڑی بڑی قربانیاں بھی پیش کی ہیں۔ اس لئے ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے۔ وہ علماء کرام بھی دین کے تمکن کو بڑی اہمیت دیتے ہیں لیکن ان کی دو باتوں پر حیرت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم کے وہ تمام الفاظ جو دین کا تصور پیش کرتے ہیں انہوں نے ان سب کو مذہب کا ہی رنگ دیا ہے۔ ان کی موجودہ دور کی تحریر کردہ تمام تفاسیر سابقہ دور کی تحریر کردہ تفاسیر کا چربہ ہیں۔ انہوں نے سابقہ تفاسیر سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام یا دین کے قیام کے بعد بھی انفرادی پرستش کے قائل ہیں۔ یہ بات خوب ذہن نشین فرمالیں کہ دین کا قیام اور انفرادی پرستش دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یا دین ہوگا یا انفرادی پرستش ہوگی۔ دین کے نظام کے اندر پرستش نہیں ہوسکتی' اس میں تو صرف احکامات خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف ایرانی علماء نے اسلامی حکومت کی اطاعت کو اطاعت خداوندی قرار نہیں دیا۔ تاہم ان کی یہ عملی صورت کہ انہوں نے اسلامی حکومت قائم تو کی ہے' یقیناً قابل ستائش ہے۔ لیکن علمی دنیا میں وہ اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں اسلامی فکر ایک ہزار سال پیشتر کھڑا تھا۔ اور یہ بات واقعاً تعجب کی ہے کہ قرآن سے فکری راہنمائی لئے بغیر انہوں نے اتنا بڑا عظیم انقلاب کیسے برپا کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کے فکری انجماد کا سبب قرآن خالص کا سامنے نہ ہونا ہے۔ ان کا فکر احادیث کے

Parameter سے باہر ہی نہیں نکلا احادیث (شیعہ حضرات کے احادیث کے مجموعے سُنیوں کے صحاح ستہ سے مختلف ہیں) نے ان کے فکر کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ طلوع اسلام چونکہ خالص قرآنی فکر کا داعی ہے' اور فرقہ بندی کے خلاف ہے' اس لئے ہم احتیاطاً ایرانی انقلاب پر تبصرہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسکی خامیاں اور اس کے ناکام ہونے کی وجوہات تحریر کر سکتے ہیں۔ ایرانی علماء کرام کے لئے جو کچھ یہاں تحریر کیا گیا ہے' وہ ان کی تعریف ہی کی گئی ہے۔ البتہ اگر کوئی شیعہ جریدہ ایرانی انقلاب پر تبصرہ کا خواہش مند ہوگا تو اس کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔

ان دشواریوں کے باوجود اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کے دینی مفاہیم پیش کئے جائیں۔ اس مضمون میں یہ بالکل ابتدائی کوشش ہے۔ صرف ایک Pattern قائم کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے قارئین کرام کو یہ کوشش پسند آئی' تو ان کے حکم کی تعمیل میں بے شمار الفاظ کا دینی مفہوم پیش خدمت کر دیا جائے گا۔

(1+2) **صلوٰۃ وزکوٰۃ:** یہ قرآن کریم کی انتہائی اساسی اصطلاحات ہیں۔ یہ قرآن کریم کی ساری تعلیم کا مرکز ومحور ہیں۔ قرآن کریم کی ساری فکر ان دونوں اصطلاحات کے گرد گھومتی ہے۔ ان کا مذہبی مفہوم آپ سب حضرات کے سامنے ہے۔ ہر مسلمان ان مذہبی مفاہیم کے مطابق عمل کر رہا ہے اور ان کا مذہبی مفہوم' اس طرح مسلمات کے طور پر چلا آ رہا ہے کہ آج تک کبھی نہ تو ان مفاہیم کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور نہ ہی اس کے متعلق کبھی کسی نے کچھ تحریر کیا ہے۔ آپ ایک ہزار سال کا لٹریچر ملاحظہ فرمالیں ان دونوں اصطلاحات کے یہی مفاہیم ہر جگہ ملیں گے۔ ہماری معلومات کے مطابق صلوٰۃ کے مروجہ مفہوم کو سب سے پہلے محمد احمد بٹلہ نے چیلنج کیا تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان سے پیشتر ہی چند صفحات پر مشتمل کچھ مواد طبع کرایا تھا جو مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ محمد احمد بٹلہ دہلی کی مشہور برادری ''قوم پنجابیان سوداگرن'' سے متعلق تھے۔ وہ مبروص تھے' انہوں نے خود اپنے حالات میں تحریر کیا تھا کہ وہ کثیر المال اور کثیر العیال تھے۔ وہ دھاگہ کا بزنس کرتے تھے اور ''گھاٹ مارکہ'' انکا ٹریڈ مارک تھا۔ دہلی میں قطب روڈ کے قریب ان کا بزنس سنٹر تھا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ کراچی تشریف لائے تو انہوں نے پھر چند صفحات پر مشتمل کتابچہ یہاں بھی طبع کرایا اور وہ اس کو مفت تقسیم کراتے تھے۔ محمد احمد بٹلہ مرحوم کے بعد تقریباً تیس سال تک بالکل خاموشی رہی۔ پھر اس کے بعد نماز کے متعلق کئی اصحاب نے تحریر کرنا شروع کیا۔ اب تک تو اس بارے میں کافی کتابیں طبع ہو چکی ہیں جن کا علم آپ سب حضراتِ باوقار کو ہوگا۔

نماز کے متعلق تحریر کردہ موجودہ لٹریچر سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہماری موجودہ مروجہ نماز کا قرآنی صلوٰۃ سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہے اور قرآنی لفظ صلوٰۃ کا مروجہ نماز

پر کُلّی اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ (1) اقامت صلوٰۃ کے لئے اپنے ملک میں اقتدار شرط ہے۔ مغلوب ومحکوم قوم صلوٰۃ قائم نہیں کرسکتی۔ (2) صلوٰۃ صرف پڑھنے' یا پرستش کی چیز نہیں ہے بلکہ عملاً قائم کرنے کی چیز ہے۔ قرآن کریم کے مطابق مذہب کی بنیاد پرستش پر ہوتی ہے جبکہ دین کا سارا دارومدار عملاً اطاعت پر ہوتا ہے۔ دین میں انفرادی پرستش کا کوئی تصور نہیں ہوتا لیکن نماز انفرادی پرستش کے زمرہ میں آتی ہے۔ (3) احادیث کی رو سے نماز معراج شریف میں فرض کی گئی ہے۔ جو ہجرت نبوی سے چند ماہ پیشتر ہوا ہے لیکن مکی آیات میں بھی اقامت صلوٰۃ کا حکم موجود ہے' جو معراج شریف سے پیشتر نازل ہوئی ہیں۔ جب نماز معراج میں فرض ہوئی ہے تو ان مکی آیات میں نازل شدہ صلوٰۃ کے احکامات کا کیا مفہوم ہے۔ (4) صلوٰۃ فحشا ومنکر سے روکتی ہے جبکہ نماز کے لئے یہ شرط نہیں ہے۔ اگر کسی شخص نے ایک بجے دوپہر کو رشوت لی ہے اور دو بجے نماز پڑھتا ہے' اس کی نماز ہوگئی' خواہ اس کے بعد وہ پھر رشوت لے لے۔ رشوت لینا مبطلاتِ نماز میں کسی فقہ کی کتاب میں شامل نہیں ہے۔ چنانچہ

نماز عصر پڑھی کاٹ کے سرِ شبیر
حَرم کو لُوٹ کے مغرب کی پھر کہی تکبیر

سرِ شبیر کاٹنے اور حرم کو لوٹنے سے نماز کی ادائیگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ (5) نظامِ صلوٰۃ میں اپنے اموال اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہیں کرسکتے (القرآن 11/87) لیکن نماز میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔

ان پانچ آیاتِ کریمات سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ مروجہ نماز صلوٰۃ کا ایک جزو یا حصہ تو ہو سکتا ہے' صلوٰۃ نہیں ہے لیکن یہ کہ پھر صلوٰۃ سے صحیح قرآنی مفہوم کیا ہے' اب تک کے تحریر کردہ موجودہ دور کے لٹریچر سے یہ دوٹوک طور پر واضح نہیں ہوتا۔ ہمارا گزشتہ سابقہ لٹریچر کیونکہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے تحریر کیا گیا ہے اس لئے اس سابقہ لٹریچر میں کوئی روشنی یا راہنمائی نہیں ملتی۔ صلوٰۃ کے موضوع پر کام کرنے والے علماء وسکالرز بھی کسی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کچھ جدید حلقوں میں نماز کے خلاف لٹریچر کی بے حد پذیرائی ہورہی ہے۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ نماز سے قرآنی موعودہ نتائج برآمد نہیں ہورہے ہیں' اس لئے لوگوں کی رغبت ومیلان نماز کی طرف نہیں رہا۔ اس مضمون میں صلوٰۃ کے متعلق جو کچھ عرض کیا جارہا ہے وہ صرف میری ذاتی سوچ ہے۔ اس کے تحریر کرنے سے صرف یہ مدعا ہے کہ یہ سوچ آپ کے زیر غور آجائے۔

(2-1) قرآنِ کریم میں صلوٰۃ وزکوٰۃ کے الفاظ جہاں کہیں بھی اکٹھے ساتھ استعمال ہوئے ہیں' تو اس سے مراد اسلامی نظام ہوتا ہے (22/41) جو نظام قرآنِ کریم کے احکامات وحدود نافذ کرتا ہے۔ یہ نظام ایک ایسا معاشرہ قائم

کرتا ہے کہ جس میں سب افراد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ازخود ہوتی چلی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق صرف مال و دولت و اجناس سے نہیں ہے انسان کی ساری صلاحیتوں سے اس کا تعلق ہے۔ ازواج مطہرات کو بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم تھا (33/33) جبکہ ان کے پاس اتنی دولت ہی نہیں تھی کہ علماء کرام کے مقرر کردہ نصاب کی رو سے ان پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہو۔ سمجھنے کی خاطر اس صلوٰۃ کو آپ صلوٰۃ تمکنہ سے موسوم کر سکتے ہیں۔

دوسری طرح کی صلوٰۃ' صلوٰۃ موقت ہے (5/6, 4/103) یہ وہ اجتماعات ہیں جو ہماری نماز کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اس صلوٰۃ کے اوقات قرآن میں نہیں ہیں اور نہ ہی اس کی جزئیات قرآن کریم نے مقرر فرمائی ہیں۔ جب قرآن کریم نے خود ان کی جزئیات کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی' تو پھر انکی جزئیات قرآن سے کس طرح نکالی جا سکتی ہیں۔ اس میں زمانہ کے ساتھ ردوبدل ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے حکم دیا: اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (5/8)۔ عدل کرو کہ یہ تقویٰ سے قریب ہے۔ حضورﷺ کے دور ہمایوں میں عدل کرنے کے طریقے نہایت آسان تھے۔ مسجد میں ہی نماز کے بعد عدل کر دیا جاتا تھا (5/106)۔ اب عدل کرنے کے طریقے بالکل مختلف ہیں۔ گواہوں کے علاوہ دستاویزات' فوٹو سٹیٹ کاپیز' انگوٹھے کے نشانات' DNA وغیرہ سے عدل کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔ جس طرح اعْدِلُوا کا حکم ہے بالکل اسی طرح اقیموا الصلوٰۃ کا حکم ہے۔ جب عدل کے طریقے برابر بدلتے چلے جا رہے ہیں تو اقیموا الصلوٰۃ میں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن یہ تبدیلی صرف اسلامی حکومت' خلافت علیٰ منہاجِ نبوت ہی کر سکتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے صلوٰۃ موقت وہ اجتماعات ہیں جو اسلامی نظام قائم کرنے کے ذرائع ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں اسلامی نظام قائم کرنے کی تدابیر زیرغور لائی جاتی ہیں اور ان پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ اس میں ہماری بزموں کے درس بھی شامل ہو سکتے ہیں اور جب اسلامی نظام قائم ہو جاتا ہے تو یہ ادارے اس نظام کو رواں دواں رکھنے کے کام آتے ہیں۔ اگر ہماری موجودہ نماز میں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوششیں شامل کر دی جائیں تو یہی نماز صلوٰۃ میں منتقل ہو سکتی ہے اور یہ صلوٰۃ موقت قرار پا سکتی ہے (4/103)۔

(3) **ذکر** کا مذہبی مفہوم درود پڑھنا اور تسبیح پھیرنا ہے۔ ذکر کی محفلیں سجائی جاتی ہیں جن میں حق اللہ' ھو اللہ' قسم کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ دین کی رو سے ذکر خود قرآن کریم ہے (16/44)۔ یہ ذکر اسلامی حکومت کا دستور Constitution ہوتا ہے' اسلامی حکومت کے اس دستور پر عمل کرنا اور اس کے تمام احکامات کو ہر وقت پیش نگاہ رکھنا اور ان کو عملاً جاری کرنا ذکر ہے۔ طاغوت کے

نظام کو اکھیڑ کر نظام خداوندی قائم کرنا ذکر ہے (20/42, 20/34) اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے۔

(4) **رکوع**۔ مذہب میں رکوع نماز کا ایک رکن ہے لیکن دین میں اسلامی حکومت کے احکامات کی عملاً اجتماعی طور پر اطاعت کرنا رکوع ہے۔ وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ وَارْكَعُواْ مَعَ الرَّاكِعِينَ (2/43)۔ (مفہوم) اسلامی نظام قائم کرو جس میں ہر فرد کی نشوونما کا انتظام کرو' اور تم بھی ان میں شامل ہو کر' اسی طرح اسلامی حکومت کی اطاعت کرو۔ مومنین اسلامی حکومت قائم کر کے سب کی نشوونما کا انتظام کرتے ہیں' اور ہمیشہ اسلامی حکومت کی اطاعت کرتے رہتے ہیں۔ (5/55)۔

(5) **سجدہ**۔ مذہب میں نماز کا ایک رکن ہے' لیکن دین میں اسلامی حکومت کے احکامات کی اطاعت سجدہ ہے۔ اور وہ مقامات' جہاں سے اسلامی حکومت کے احکامات جاری ہوں وہ مساجد کہلاتی ہے۔ مساجد وہ عمارات نہیں ہیں کہ جن میں صرف نماز ادا کی جائے بلکہ وہ مقامات اور وہ مراکز ہیں جہاں سے اسلامی احکامات کی اطاعت کرائی جاتی ہے۔

(6) **عبادت**۔ مذہب میں اس سے مراد پرستش ہوتی ہے۔ دین میں اس کے معنے اطاعت کے ہیں۔ دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق ادا کیا جائے' عبادت ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کی رو سے عبادت اور عام دنیاوی امور میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ عبادت کے لئے نہ کسی الگ مکان یا جگہ ہے اور نہ ہی اس کے اوقات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی حکومت کے احکامات کی اطاعت ہر وقت کی جا سکتی ہے' اور اس کی اطاعت سے ہر وقت عبادت خداوندی ہوتی رہتی ہے۔

(7) **الٰہ**۔ مذہب میں اس سے مراد وہ ذات ہے جس کی پرستش کی جائے۔ پرستیدہ کو الہ کہا جاتا ہے۔ لیکن دین میں الہ کے معنے حاکم کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا: لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَهاً غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ (26/29)۔ اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو الہ تسلیم کیا تو میں تجھے قید کر دوں گا' تو یہاں الہ کے معنے حاکم کے ہی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح' أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ (25/43)۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات کو اپنا الہ بنا لیا ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے: وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاء إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ (43/84)۔ وہی ہے جو کائنات کی بلندیوں میں بھی حاکم ہے اور پستیوں میں بھی۔ لا الٰہ الا اللہ کے معنے ہی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا اور کوئی حاکم نہیں ہے۔

(8) **تقویٰ**۔ مذہب میں پرستش کی انتہائی شکل سے

تقویٰ حاصل ہوتا ہے' اس کا مفہوم پرہیزگاری بھی لیا جاتا ہے' جبکہ دین کی رو سے تقویٰ کے معنے اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کی اطاعت ہے۔ سورہ مائدہ میں تقویٰ کے مقابلہ میں عدوان کا لفظ آیا ہے (5/2) عدوان کے معنے ہیں سرکشی لہٰذا تقویٰ کے معنے قانونِ خداوندی کی ہمہ جہت اطاعت ہے۔ دین کی رو سے اسلامی حکومت کی اطاعت تقویٰ ہے۔ پرہیزگاری اور پرستش تقویٰ نہیں ہے' جس قدر اسلامی حکومت کی اطاعت گذاری کی جائے گی' اس درجہ تقویٰ میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

(9) **شعائر اللہ۔** مذہب میں' نذر' نیاز' مزادات' تعزیہ' ذوالجناح' شعائر اللہ ہیں۔ دین میں اسلامی مملکت کی محسوس علامات اور اس کے ظواہر شعائر اللہ ہیں۔ اسلامی مملکت کا جھنڈا' اس کی کرنسی' اس کا پاسپورٹ وغیرہ سب شعائر اللہ ہیں۔ دوسرے ممالک کی حکومتیں' اسلامی مملکت کے ان شعائر کا احترام کریں گی۔ اگر کوئی حکومت اسلامی مملکت کے ان شعائر کی توہین کرے گی' تو یقیناً اسلامی مملکت اس بارے میں ان سے احتجاج کرے گی کیونکہ حکم خداوندی ہے کہ: لاَ تُحِلُّواْ شَعَآئِرَ اللّهِ (5/2)۔ شعائر اللہ کی بے حرمتی نہ کرو۔

(10) **ولی اللہ۔** مذہب میں ولی اللہ مجذوب' مختل' مخبوط الحواس' اور بہت ''پہنچے ہوئے'' کو کہتے ہیں لیکن دین میں ولی اللہ وہ ہوتا ہے جو اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے۔ ولی' عدو' کی ضد ہے جس کے معنے دشمن کے ہیں۔ قرآن کریم نے اسلامی نظام کے دشمنوں کو عدواللہ کہا ہے (60/1, 80/60) لہٰذا اسلامی نظام کے دوست اور اس کے مددگار ولی اللہ ہوں گے۔ قرآن کی رو سے اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا بلکہ ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ أَلا إِنَّ أَوْلِيَاء اللّهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَكَانُواْ يَتَّقُون (10/63)۔ آگاہ رہو کہ اس میں شک نہیں کہ اللہ کے دوستوں پر کوئی خوف وحزن نہیں ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ ہر وہ شخص جو ایمان لاتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے' اس آیہ کی رو سے ولی اللہ ہے۔

(11) **استغفار۔** مذہب میں استغفار' دعا درود اور تسبیح پھیرنے' سے حاصل ہوتی ہے لیکن دین میں استغفار اسلامی حکومت کے قوانین کی پناہ میں آنا ہوتا ہے۔ یہ حفاظت طلبی اور عفو خواہی خدا اور بندے کے درمیان انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ درمیان میں پڑے اور وہ بحیثیت صدر مملکت' اس کے لئے حفاظت طلب کرے' بشرطیکہ اس کی یہ حفاظت اور عفو خواہی اسلامی حکومت کے قوانین کے مطابق ہو۔ اور حکومت کے قوانین میں اس کی عفو خواہی کی گنجائش ہو۔

(12) **تہجد۔** مذہب میں رات کے آخری حصہ میں نماز پڑھنے کو تہجد کہتے ہیں۔ تہجد کا لفظ اضداد میں سے ہے۔ اس کے معنے سونا اور جاگنا دونوں ہوتے ہیں۔ یہ لفظ قرآن کریم میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ (17/79)۔ ''اور رات کے ایک حصہ میں قرآن کے ساتھ جاگو۔ یہ صرف تیرے لئے ہے۔'' دوسری جگہ اسی کو قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلاً (73/2)۔ رات کو قیام کر مگر تھوڑا عرصہ چھوڑ کر۔ دن میں حضورﷺ کو بہت کام ہوتے تھے۔ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحاً طَوِيلاً (73/7)۔ اس لئے حضورﷺ کو حکم تھا کہ وہ رات کو قرآن کریم پر غور و فکر کر کے نظام کے قیام کی تدابیر سوچیں اور دن کو ان تدابیر کو عمل میں لائیں۔ قرآنی انقلاب کے اولیں مراحل میں پروگرام اس قدر مشکل ہوتا ہے کہ اس کے لئے دن کے علاوہ راتوں کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ تہجد سے مراد رات کی نماز نہیں ہوسکتی۔

(13) **نذر۔** مذہب میں نذر اور نیاز کے الفاظ ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ نذر اللہ اور نیازِ حسین عموماً کہا جاتا ہے' نیاز تو فارسی لفظ ہے جس کے معنے محبت کے ہیں۔ اللہ نذر سے مراد حلوہ' پوری' کچوری وغیرہ پر کچھ دعائیں پڑھ کر خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا ہوتا ہے۔ آج کل یہ عموماً Social gathering کے کام بھی آتی ہے۔ جبکہ دین میں یہ لفظ واجبات کی ادائیگی کے لئے آتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معانی میں (76/7) میں آیا ہے یعنی وہ امور جو آپنے خود اپنے پر واجب قرار دے لئے ہوں۔ اگر کسی گاؤں میں بچوں کا سکول نہیں ہے تو اس گاؤں کے لوگ حکومت سے درخواست کریں کہ حکومت ان کے گاؤں میں ایک سکول کھول دے اور گاؤں کے وہ لوگ پچاس فیصد اخراجات اس سکول کے خود برداشت کر لیں گے اور حکومت سے مالی تعاون کریں گے۔ حکومت سے یہ مالی تعاون نذر ہے اور قرآن کریم کی رو سے اس مالی تعاون کو پورا کرنا ضروری ہے۔ دین کی رو سے تعاون کے واجبات ادا کرنا نذر پوری کرنا ہوتی ہے۔ حلوے' پراٹھے کھانا اور علماء کو کھلانا نذر پوری کرنا نہیں ہے۔

(14) **توبہ۔** مذہب میں کسی برے کام کرنے کے بعد' اللہ سے دعا مانگنا کہ اللہ ان برے اعمال کی گرفت نہ کرے توبہ ہے۔ دین میں توبہ ایک عملی اقدام ہے جس سے غلط کام کو Undo کیا جاتا ہے۔ (1) آپ غلط راستے پر چلے گئے معلوم کرنے پر آپ کو احساس ہوا کہ آپ کا راستہ غلط ہے اور درست راستہ دوسری سڑک پر جاتا ہے۔ اب آپ کو اس صحیح راستہ تک جانے کے لئے واپس آنا ہوگا۔ آپ کا غلط راستہ چھوڑ کر' صحیح راستہ پر آجانا توبہ ہے۔ (2) آپ نے کسی شخص سے بدسلوکی کی اس کی رقم واپس نہیں لوٹائی۔ جب آپ کو اپنے اس غلط کام پر شرمندگی ہوئی تو آپ فوراً اس کی رقم ادا کر دیں' اس شرط کے ساتھ کہ آپ آئندہ کبھی'

اس کی یا کسی اور شخص کی رقم کو زبردستی نہیں ہتھیا لیں گے۔تو یہ آپ کی توبہ ہوئی۔اسلام آباد میں زلزلہ کی وجہ سے جو ٹاور گر گیا تھا۔اس کے بعد اہالیان علاقہ نے مجموعی طور پر توبہ کی تھی لیکن یہ مذہبی توبہ تھی۔جن اہالیان علاقہ نے اجتماعی توبہ کی ان کا اس ٹاور کے گرنے سے کوئی تعلق نہیں تھا' اس توبہ کا تعلق صرف ان Contractor سے تھا جنہوں نے اس ٹاور کی تعمیر میں سستا مٹیریل استعمال کیا تھا۔دینی توبہ یہ ہے کہ اس ٹاور کو تعمیر کرنے والے سخت ندامت محسوس کریں اور آئندہ عمارات کی تعمیر میں درست مٹیریل استعمال کریں اور سستے مٹیریل کے استعمال سے اجتناب کریں لیکن اگر وہ Contractors اور وہاں کے سارے رہائشی حضرات زبانی توبہ کریں اور توبہ کی تسبیح پھیریں' لیکن عمارات میں مٹیریل اسی طرح کا استعمال کرتے رہیں تو یہ توبہ نہیں ہے۔

(15) **درود شریف**۔ مذہب میں درود شریف چند الفاظ کو چپکے چپکے یا بلند آواز سے پڑھنا ہوتا ہے۔عام مذہبی جلسوں خصوصاً مجالس میں مقرر یہ کہتے ہیں کہ ''آویں درود دیاں چھالاں'' جس سے مراد ہوتی ہے کہ مجمع بلند آواز سے درود شریف پڑھے چنانچہ مجمع بلند آواز سے درود پڑھتا ہے۔مذہبی کتابوں میں اس کے بہت فضائل لکھے ہوئے ہیں۔میلاد اکبر میں ہے۔

پڑھو درود پڑھو مومنو درود پڑھو
درود سے کبھی غافل نہ ہو' درود پڑھو

لیکن دین میں اس کے معنے (1) اللہ اور کائناتی قوتوں کا مومنین کی حوصلہ افزائی کرنا ہے (33/43)۔خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اور اس کے ملائکہ نبی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' اے مومنو تم بھی نبی کی حوصلہ افزائی کرو اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے وسلموتسلیماً اس کی اطاعت کرو (33/56)۔ درود کی عملی شکل رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے۔

(16) **صدقہ**۔ مذہب میں کسی مصیبت کو ٹالنے کے لئے جو رقم خیرات کی جائے' یا جو بکرا ذبح کر دیا جائے وہ صدقہ کہلاتا ہے' لیکن دین میں ہر وہ چیز جو خدا کی راہ میں خرچ کی جائے صدقہ کہلاتی ہے۔صدقہ واجب نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنی خواہش سے دیا جاتا ہے جبکہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔اگر کسی اسلامی حکومت کی' کسی ملک سے لڑائی ہو جائے' یا کوئی ارضی وسماوی آفت واقع ہو جائے' تو زکوٰۃ کے علاوہ جو رقوم مملکت کے باشندے' بطور مدد کے اس مملکت کو دیں وہ مدد صدقہ کہلاتی ہے۔لیکن یہ صدقہ اجتماعی طور پر وصول کیا جاتا ہے' اور اجتماعی طور پر ہی خرچ کیا جاتا ہے۔(9/103, 6/60)۔

(17) **ثواب**۔ مذہب میں ثواب کے معنے واضح نہیں ہیں۔مختلف حضرات کے سامنے اس کا مختلف مفہوم ہے۔ مجموعی طور پر تاثر یہ ہے کہ ایسے کام جن کے کرنے سے آخرت کی زندگی اچھی ہوتی ہے' ان کے سرانجام دینے سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔اس ثواب کا اس دنیا سے کوئی تعلق

نہیں ہے یہ ثواب صرف آخرت میں کام آتا ہے' لیکن دین میں ثواب کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلامی حکومت کے قوانین کے اتباع سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ اس کا ثواب ہیں۔ قرآن کریم نے قرآنی نظام زندگی کے نتائج کو ثواب الدنیا کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً (28/80)۔ جس نے اس نظام کی حقانیت کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد ایسے کام کئے جو انسانی معاشرہ میں ہمواری کا سبب بنیں تو ان کے لئے اس نظام کے نتائج بڑے خوشگوار ہوں گے۔ ان نتائج کا نام ثواب الدنیا والآخرۃ ہے۔

(18) **تسبیح**۔ تسبیح پھیرنے سے مراد دانوں پر خدا کا نام پڑھنا ہوتا ہے' اس کو تسبیح فاطمہ یا تسبیح زہرا بھی کہتے ہیں۔ چونکہ روایات کے مطابق تسبیح کے اس طریقہ کی تلقین حضورﷺ نے حضرت فاطمہ الزہرا علیہا السلام کو کی تھی' اس لئے یہ تسبیح ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب ہے۔ جن حضراتِ عالی مقام کو سو دانوں کی تسبیح سے تسلی نہیں ہوتی' اور ''عبادتِ خداوندی'' کے لئے مزید کچھ تشنگی محسوس فرماتے ہیں' وہ ''ہزارا'' استعمال کرتے ہیں' جس میں ایک ہزار دانے ہوتے ہیں۔ لیکن دین میں تسبیح کے معنے سرگرمِ عمل رہنا' اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کرنا ہوتے ہیں۔ کائنات میں ہر شئے خدا کی تسبیح کرتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہر شئے اپنے اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہے (59/24 ,62/1 ,61/1) سورج کی صلوٰۃ دھوپ فراہم کرنا' اس دھوپ سے فصل پکانا اور بخارات اٹھانا ہے۔ سورج کا اپنے ان فرائض مفوضہ' یعنی صلوٰۃ کو تسلسل سے ادا کرتے رہنا' اس کی تسبیح ہے۔ جب تک سورج اپنی روشنی سے فصل پکا رہا ہے' بخارات اٹھا رہا ہے وہ اپنی تسبیح ''پڑھ'' رہا ہے۔ باقی ہم مسلمانوں میں جو حضرات تسبیح یا ہزارا پڑھتے ہیں' تو ان کے لئے گزارش ہے کہ نزول قرآن کے وقت تو عربوں میں دانوں کی اس تسبیح کا تصور ہی نہیں تھا' تسبیح تو گوتم بدھ کی ایجاد ہے۔ پھر یہ عیسائی راہبوں میں آئی۔ ان سے یہ ایرانیوں میں آئی۔ ان ایرانیوں نے ہی اس کو داخل اسلام کیا۔ ورنہ قرآن میں تو تسبیح پھیرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے قرآن میں تو خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل میں انتہائی جدوجہد کرنے کا نام تسبیح ہے۔

(19) **شرک**۔ مذہب میں بتوں کو پوجنا شرک ہے۔ لیکن دین میں یہ قرآن کریم کی ایک بنیادی اصطلاح ہے۔ دین میں اس کے معنے غیر خدائی قوتوں کو خدا کے برابر سمجھنا ہے جو اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں دوسروں کو ان کا حامل سمجھنا شرک ہے۔ خدا کے حق ملکیت میں دوسروں کا حق تسلیم کرنا شرک ہے۔ کسی شخص کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص سے اپنی اطاعت

کرائے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے احکامات کی اطاعت کرنا شرک ہے۔ شرک کرنے سے انسان خود اپنی ذات کو ذلیل کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے شرک سب سے بڑا جرم ہے جو انسان سے اس کا صحیح مقام چھین لیتا ہے (31/13)' اسلامی نظامِ حکومت میں احکام الٰہی کا سرچشمہ صرف قرآنِ کریم ہوتا ہے۔ قرآن کے علاوہ کسی اور قانون کا اضافہ کرنا شرک ہوتا ہے۔

(20) **حدود اللہ۔** مذہب میں حد کسی جرم کی اس سزا کو کہتے ہیں جسے خود قرآن نے متعین کر دیا ہو۔ لیکن دین میں قرآن کریم کے تمام اصول وقوانین' احکامات' اوامر و نواہی' سب حدود اللہ ہوتے ہیں یہ حدود غیر متبدل اصول ہیں۔ جن کے تابع جزئیات' ہر زمانہ کی اسلامی حکومت' اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق خود مرتب کرے گی۔ البتہ یہ اصول غیر متبدل رہیں گے۔

ان بیس الفاظ کے مذہبی و دینی مفاہیم پیش خدمت عالی کئے گئے ہیں۔ اگر جناب نے ان کو پسند فرمایا تو اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے گا اور اس طرح اس دینی مفاہیم کی ایک الگ فہرست تیار ہو جائے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

ذکر کا مفہوم

ذکر کے معنی ہیں کسی چیز کو محفوظ کر لینا۔ کسی بات کو یاد کر لینا۔ حفاظت کرنا۔ ضائع نہ کرنا اور تذکرہ کے معنی ہیں وہ جس سے کسی کو کوئی بات یاد دلائی جائے۔

شہرت اور شرف و عزت کو بھی ذکر کہتے ہیں۔ نیز عبرت اور موعظت کو بھی۔ ''ذکر'' اس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں دین کی تفصیلات اور امتوں کے قوانین درج ہوں۔ لہٰذا یہ لفظ قانون کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ذکر اللہ سے مراد قوانینِ خداوندی ہیں جن کے اتباع سے شرف و عظمت، غلبہ اور قوت حاصل ہوتے ہیں۔ نیز اقوامِ سابقہ کے وہ تاریخی شواہد جن سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں ''اللہ کے ذکر'' سے مراد ہوتا ہے زبان سے اللہ اللہ کہنا اور اسے تسبیح کے دانوں پر گنتے جانا یا خانقاہوں، مساجد اور گھروں میں مجلس و محفل جما کر ''ہوحق'' کی ضربیں قلب پر لگانا۔ یہ ذکر اللہ کا قرآنی مفہوم نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے، ذکر اللہ سے مراد یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبے میں اور سفرِ حیات کے ہر موڑ پر، خدا کے قانون کو سامنے رکھے اور اس کے مطابق چلے۔ خدا کے احکام و ضوابط کو ہر وقت سامنے رکھے۔ انہیں کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔

قرآن کریم نے جو بار بار کہا ہے کہ وہ لوگوں کو یاددہانی کراتا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ یاددہانی کس بات کی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے جو تعلیم بھیجی تھی، وہ اصولی طور پر شروع سے اخیر تک ایک ہی تھی لیکن وہ ذہنِ انسانی یا حوادثِ زمانہ کی وجہ سے اپنی اصلی شکل میں کہیں باقی نہ رہی تھی۔ قرآن اسی فراموش کردہ تعلیم کی یاددہانی کراتا ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا۔ وہی مستقل اقدار جو وقتاً فوقتاً دی جاتی رہیں، وہ انسانوں کی توجہ انہی کی طرف مبذول کراتا ہے۔ خود قرآن کے اندر جو اصول و احکام بیان کئے گئے ہیں، انہیں بھی وہ بار بار مختلف پہلوؤں سے سامنے لاتا ہے اور اس طرح ایک مقام کی یاددہانی دوسرے مقام سے ہو جاتی ہے۔ قرآن آسمانی تعلیم

کی فراموش کردہ حقیقتوں کی یاددہانی ہے۔ اسی کو تذکرہ اور ذکر کہا جاتا ہے۔ نیز وہ اقوامِ سابقہ کے احوال وکوائف سے اس حقیقت کی یاددہانی کراتا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت کس قدر سخت ہوتی ہے۔ اس طرح بار بار یاددہانی سے انسان کے دل میں ان قوانین کی اہمیت اور عظمت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور انسان ان کی پابندی کی طرف توجہ دیتا ہے۔

ذکر کا لفظ قرآن کریم کے بے شمار مقامات پر آیا ہے۔ یہاں ان تمام آیات کو جن میں یہ لفظ آیا ہے سامنے لانا ممکن نہیں اس لئے ان میں سے چند آیات جن سے اوپر دیئے گئے لفظِ ذکر کے معانی میں سے کسی نہ کسی معنے کا مفہوم واضح ہوتا ہے' سامنے لائی جارہی ہیں۔

وَهَـذَا ذِكْـرٌ مُّبَـارَكٌ أَنـزَلْـنَـاهُ أَفَأَنتُمْ لَـهُ مُنكِرُونَ(۲۱/۵۰).

اور یہ قرآن (ذکر) ہماری طرف سے نازل کردہ ضابطہ حیات ہے جو زندگی کی خوشگواریوں کا ضامن ہے۔ تو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو؟

لَـقَـدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ(۲۱/۱۰).

ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطہ قوانین نازل کیا ہے اس میں خود تمہارے شرف اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر تم ذرا عقل وبصیرت سے کام لے کر سمجھنے کی کوشش کرو (تو یہ حقیقت تم پر واشگاف ہو جائے گی کہ یہ ضابطہ قوانین تمہیں بلندیاں اور سرفرازیاں عطا کرنے کے لئے دیا گیا ہے اس سے خدا نے کوئی اپنا مقصد حاصل نہیں کرنا۔

فَـاذْكُـرُونِـىْ أَذْكُـرْكُمْ وَاشْكُرُواْ لِىْ وَلاَ تَكْفُرُونِ(۲/۱۵۲).

اگر تم میرے قوانین کو پیشِ نظر رکھو گے تو میں تمہیں شرف وعظمت عطا کر دوں گا۔ لہٰذا تمہیں جو ایسی عظیم نعمت دی گئی ہے' اس کی قدر کرو۔ اس ضابطہ کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔

سورہ عنکبوت کی آیت ۴۵ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نظامِ الصلوٰۃ کے نتیجہ میں افرادِ معاشرہ (مملکت کی آبادی) بخل اور عقلِ خود بیں کی فریب کاریوں سے رُک جایا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہے کہ:

وَلَـذِكْـرُ اللَّـهِ أَكْبَـرُ وَاللَّـهُ يَـعْـلَمُ مَـا تَصْنَعُونo

اللہ کا آئین و قوانین۔ اللہ کا ضابطہ حیات (دستور)۔ اللہ کا غلبہ وتسلط۔ اقتدارِ اعلیٰ' اکبر یعنی بلند ہے۔ اس کے مقابلہ میں تمہارے خود ساختہ نظام اور آئین وقوانین کیا کرتے ہیں' خدا کو اس کا اچھی طرح علم ہے۔

بات کتنی صاف سیدھی اور سمجھنے میں آسان ہے لیکن مذہبی

پیشوائیت کی طرف سے اس آیت کا غلط مفہوم تھونپنے سے امت مسلمہ بالعموم اور بالخصوص انڈین مسلم اور اب پاکستانیوں کی روش کو دیکھ کر، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کی سکیم کے ضمن میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ابلیسی سکیم ایسی کارگر ثابت ہوئی کہ ہمارے ہاں اللہ کے قوانین کی اہمیت ہی مفقود ہوگئی۔ لاقانونیت نے ایسا ڈیرہ ڈالا کہ حالات دن بدن بگڑتے جارہے ہیں۔

سورہ المومنون میں ہے کہ:

قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ٥ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ٥ (٨٥۔٨٤/٢٣)۔

(تم ان سے اس باب میں زیادہ بحث نہ کرو۔ ان کے نظامِ زندگی کے متعلق بات کرو ان سے پوچھو) اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ کس کی ملکیت ہے؟ یہ تسلیم کریں گے کہ یہ اللہ کی ہے۔ تو ان سے کہو کہ کیا اس سے تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے (کہ جو کچھ اللہ کا ہے اسے اللہ ہی کے لئے رہنا چاہئے۔ اسے انسان کو اپنی ملکیت نہیں بنالینا چاہئے)۔

اسمِ رب (خدا کی صفتِ ربوبیت) کو سامنے رکھو۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ٥ (٧٦/٢٥)۔

صبح وشام ہر وقت، خدا کی صفتِ ربوبیت کو اپنے سامنے رکھو اور اس کی روشنی میں نظامِ ربوبیت کی تشکیل میں سرگرمِ عمل رہو۔

برادرانِ اسلام سوچئے! کیا رنگین دانوں کی تسبیح ہاتھوں میں لٹکائے پھرنے اور تواتر سے ذکر کی محفلیں سجانے سے خدا کے نظامِ ربوبیت کے پروگرام کی جو قرآن کی پہلی سورت کی پہلی ہی آیت میں دیا گیا ہے تکمیل ہو جائے گی؟ کیا خدا کا نام جپنے سے **ربّ العالمینی** کے محکم اصول پر معاشرہ کی تشکیل ہو جائے گی؟

قرآن کریم میں عائلی زندگی سے متعلق قوانین اور فرائضِ منصبی کی وضاحت کے بعد ہے کہ:

فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ٥ (٢/٢٣٩)۔

اللہ کو یاد کرو (رکھو) جیسا کہ اس نے تمہیں سکھایا اور بتایا ہے۔ تم اس سے پہلے، ان امور سے واقف نہیں تھے۔

اس سے اللہ کو یاد کرنے یا اللہ کے ذکر کا مفہوم بہت حد تک سامنے آ گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الحاقۃ

(آیات 13 تا اختتام)

عزیزانِ من! آج نومبر 1983ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحاقۃ کی آیت 13 سے ہو رہا ہے: (69:13)۔

قرآنِ حکیم کا پہلا انقلاب

اس سورۃ کی ابتداء ہوئی تھی: اَلْحَآقَّةُ o مَا الْحَآقَّةُ o وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْحَآقَّةُ (69:1-3) ایک واقعہ جو حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آنے والا ہے اور کہا ہے کہ وہ کیا ہے؟ خدا تمہیں بتاتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ اِسے پھر دہرادوں کہ ان آخری دو پاروں میں قرآنِ کریم نے کچھ انقلابات کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ انقلابات تو وہ ہیں جو طبعی طور پر اس باہر کی دنیا میں نظر آنے والے ہیں مثلاً یہی کہ چاند پھٹ جائے گا' سورج تاریک ہو جائے گا' ستارے ٹوٹ جائیں گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جہاں تک سائنس کے انکشافات ہیں' وہی ان انقلابات کے صحیح معنی ہمیں بتا سکتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے کہ میں نے مورس بکائے کی کتاب

The Bible , The Quran & and Science

کا ذکر کیا تھا۔ وہ بہت بڑا Scientist (سائنسدان) ہے۔ قرآنِ کریم کی یہ آیات جن کا تعلق خارجی کائنات کے طبعی امور سے ہے' اس شخص نے ان کا مطالعہ کیا اور ایک ایک آیت کا صحیح ترجمہ' صحیح مفہوم' بیان کرنے کے بعد اس نے یہ کہا کہ میں دنیا بھر کے Scientists (سائنسدانوں) کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ بتائیں کہ کیا یہ بات تیرہ سو سال پہلے' عرب کی سر زمین کا ایک اَن پڑھ شخص' اپنی طرف سے کہہ سکتا تھا جبکہ دنیا میں بڑے سے بڑا Scientist (سائنسدان) بھی اس نکتے تک نہیں پہنچ سکتا تھا جو اس نے کہا ہے' اور آج اس ڈیڑھ ہزار سال کے بعد جو ہم لوگوں نے سائنس کے انکشافات کیے ہیں وہ اس کی صداقت کی شہادت دیتے ہیں۔ تو یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق علومِ سائنس سے ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن تو ذکر للعلمین ہے' تمام نوعِ انسان کے لیے ایک تذکرہ ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ہو' کوئی فرد ہو' جو بھی اس طرح سے ان طبعی حقائق پر

پڑے ہوئے پردوں کو اٹھائے گا' وہ بتا سکے گا کہ قرآن کی ان آیات کے مفاہیم کیا ہیں۔

عزیزانِ من! یہ یاد رکھیے کہ کوئی چیز ایجاد نہیں ہوتی بلکہ Discovery (بے نقاب) ہوتی ہے' اس کا اکتشاف وانکشاف ہوتا ہے' ان پر سے صرف پردہ اٹھانا ہوتا ہے۔

قرآن کا دوسرا اور تیسرا انقلاب

دوسرا انقلاب وہ ہے جس کا تعلق مرنے کے بعد کی زندگی سے ہے۔ اس انقلاب کے متعلق آج کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایک یقین کی بات ہے' ایک ایمان کی بات ہے۔ انقلابات کا تیسرا درجہ وہ ہے' جو قوموں کی زندگی میں آتا ہے' عروج وزوال کی شکل میں' تباہیوں کی شکل میں آتا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر کہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کیا حقیقت ہے جو' اب سامنے آنے والی ہے' بتایا ہے کہ یہ انقلاب حق اور باطل کی کشمکش تھی۔ نبی اکرم ﷺ کی دعوت اور اس کی مخالفت کی کشمکش تھی' جس میں شدید ترین مخالفت قریش کی طرف سے ہو رہی تھی۔ یہ بڑے بڑے ٹکراؤ تھے جو قریباً چھ سات سال تک مسلسل ان کے ساتھ جنگوں کی صورت میں جاری رہے۔ ان سے قدم قدم پہ کہا جاتا تھا کہ تمہارا نظام باطل ہے۔ یہ حقیقت میں دو نظاموں کا ٹکراؤ ہے' تم دیکھو گے کہ آخر الامر تمہارا نظام شکست کھا جائے گا کیوں کہ یہ باطل کی بنیادوں پر اٹھا ہوا ہے اور اپنی قوتِ استبداد واستحصال کی بنا پر وہ فریب یا مغالطے یا غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ وہ اس بات کا مذاق اڑاتے تھے کہ یہ ایک خانماں خراب ہے۔ نہ گھر نہ بار' نہ کوئی فوج' نہ کوئی مملکت اور ہم سے کہہ رہا ہے کہ ہم تباہ ہونگے اور یہ کامیاب ہوگا۔ ان حالات میں یہ باتیں کہی جارہی تھیں۔

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ پہلے تاریخی شہادات پیش کرتا ہے۔ پہلے ہی الحاقۃ کہنے کے بعد وہ فوراً' عاد اور ثمود اور قومِ لوط اور فرعون کا ذکر کر رہا ہے۔ اس سے نظر آ گیا کہ یہ جو آگے انقلاب بیان ہو رہا ہے یہ قوموں کی تباہیوں کا اور عروج وزوال کا ہے۔ اس کا تعلق خارجی دنیا کے انقلابات سے بھی نہیں اور آنے والی آخرت کے انقلاب سے بھی نہیں کیونکہ درمیان میں وہ جو مثالیں دے رہا ہے' وہ یہاں کی' اقوامِ سابقہ کی' تباہیوں کی مثالیں ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا انداز کیا ہے۔ تینوں قسم کے انقلابات کا ذکر قرآن میں ہے مگر وہ یہاں جو کہہ رہا ہے' وہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آئے گی۔ اس کے بعد وہ اس کی تائید میں' اُن قوموں کے زوال اور عروج کی شہادات پیش کر رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس انقلاب کا تعلق قوموں کے عروج وزوال کے جو اصول قرآن نے بیان کیے ہیں' اُن سے ہے۔ اب ان سے پچھلی قوموں کی داستانیں دہرا کر کہا جارہا ہے کہ وہ تم سے زیادہ شوکت وحشمت واقتدار میں بالاتھیں' یہ تم

خود دیکھ رہے ہو۔تم ان کی تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات پر سے دن رات گزرتے ہو' تم اپنی محفلوں میں ان کی داستانیں بیان کرتے ہو' فرق اتنا ہی ہے کہ تم صرف ان داستانوں کو بیان کرتے ہو اور ہم یہ بتاتے ہیں کہ ان کا یہ حشر کیوں ہوا تھا۔ اور یہ بتاتے اس لیے ہیں کہ اگر تم نے بھی انہی جیسا نظام قائم کیا اور قائم کیا ہوا ہے' تو اس کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان لوگوں کا انجام ہوا۔ یہ بات قریش تک ہی نہیں ہے۔

واقعات ہنگامی ہوتے ہیں اور اصول ابدی

عزیزانِ من! قرآن قیامت تک تمام اقوامِ عالم کے انسانوں کے لیے ایک ضابطہ موعظت اور نصیحت ہے۔ وہ آج بھی یہ بتا رہا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے اصول کیا ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اصول ابدی ہوتے ہیں' مگر واقعات ہنگامی ہوتے ہیں۔ تاریخ میں مورخین ہمیشہ واقعات بیان کرتے ہیں' ان کے اسباب وعلل بیان نہیں کرتے۔ وہ یہ تو بتائیں گے کہ فلاں قوم کو شکست ہوگئی' وہ بتائیں گے کہ اتنی فوج تھی' اتنا اسلحہ تھا' اتنی کمزوری تھی' ان کے ہاں یہ Strategic Weakness (حکمتِ عملی کی خامی) تھی وغیرہ وغیرہ۔قرآن یہ بتائے گا کہ ان کے نظام میں کیا خرابی تھی جس کی وجہ سے وہ قوم تباہ ہوئی ہے۔ اور یہ ہے وہ چیز جس کا تعلق قیامت تک آنے والے انسانوں سے ہے کہ ہر قوم یہ دیکھ لے کہ ہمارا نظام اس قسم کا تو نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اس کا تعلق ہمارے ساتھ بھی ہے' آنے والی قوموں کے ساتھ بھی ہے۔

قیامت میں صور پھونکنے سے مراد کیا ہے

عزیزانِ من! یہ کچھ کہنے کے بعد ان قریش سے کہا گیا کہ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ o وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (69:13-14)[1] ۔ان دو آیات کے عام ترجموں میں یہی بات کہی گئی ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا۔ یہ چیز ہمارے ہاں ہمیشہ قیامت کے لیے اٹھا رکھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہاں ایک فرشتہ ہے۔ وہ پہلے صور پھونکے گا۔ وہ صور' بگل بجانے کے لیے' سینگ جیسی ایک چیز ہوتی ہے۔اس زمانے میں یہ بگل تو نہیں ہوتے تھے' قرنا ہوتا تھا' وہ ایک لمبا سا سینگ تھا۔اس میں پھونکتے تھے تو اس سے آواز نکلتی تھی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ قیامت

---

[1] جب اعلانِ جنگ کا بگل پہلی بار بجایا جائے گا' اور بڑے بڑے لیڈر اور ان کا لاؤلشکر' سب تباہ کر دیئے جائیں گے اور ایک ہی حملہ میں (سردارانِ قوم) کی سرکشی اور تکبر کا بھرکس نکال کر رکھ دیا جائے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)۔

میں جب مردے اٹھائے جائیں گے تو وہ فرشتہ' جس کا نام اسرافیل ہے' پہلے وہ قرنا میں صور پھونکے گا۔ آواز آئے گی۔ ایک دفعہ آواز آئے گی تو وہ ایک دفعہ کی آواز پہ نہیں اٹھیں گے پھر جب وہ دوسری دفعہ زور سے پھونکے گا تو پھر سب اٹھ کھڑے ہونگے۔ صور سے مراد وہ قرنا لی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! دراصل صور سے مراد جنگ کے زمانے میں فوجوں کے اعلان کے لیے بگل کا بجایا جانا ہے۔ عرب اس کو بھی صور کہتے ہیں۔ یہ دوسری چیز ہوگئی۔ اس طرح اس دنیا کی جو آپس میں جنگیں ہوتی تھیں' ان میں جسے جنگ کا بگل بجانا کہتے ہیں' یہ بھی اس کے معنی ہوسکیں گے۔ اس کے ایک تیسرے معنی ہیں' ان میں وہ مفہوم مجازی لیا جاتا ہے یا حقیقی لیا جاتا ہے۔ صور کا یہ لفظ صورت کی جمع بھی ہے اور صورت کے معنی ہوتا ہے پیکر' جسے ایک ڈھانچہ کہا جاتا ہے' جسے پیکرِ بے جان کہا جاتا ہے۔ نفخ کا یہ لفظ قرآن میں آتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں توانائی پیدا کرنا۔ انسانی بچے کے لیے قرآنِ کریم نے یہی لفظ استعمال کیے ہیں۔

مردہ قوموں میں توانائی کا ظہور ہوگا

آدم کے لیے بھی اس کے معنی ایک ایسا انقلاب ہیں جس میں مردہ قوموں میں ازسرِ نو توانائی کی روح پھونکی جائے گی۔ اب اگر تاریخ کے شواہد کے ضمن میں یہ بات آئے گی تو اس کا یہ مفہوم ہوگا۔ اور قرآن نے مختلف مقامات پہ یہ کہا ہے۔ قوموں کو مردہ قومیں کہا ہے۔ اور یہ تو ہمارے ہاں بھی محاورہ ہے: یہ مردہ اقوام یعنی وہ مردہ یہ نہیں کہ قبروں کے اندر وہ لوگ ہوتے ہیں۔ وہ قوم زندگی کی توانائیوں سے محروم ہوتی ہے' چلتی پھرتی تو ہے لیکن وہ زندگی کی توانائیوں سے محروم ہوتی ہے۔ ان کو ازسرِ نو زندگی عطا کرنا' یہ ہے جس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تو یہاں جو صور ہے وہ ہے جسے ہم اردو میں صور کہتے ہیں۔ یہ صورت کی جمع ہے یعنی اسے یوں کہیے کہ بے جان پیکروں میں ازسرِ نو توانائی پھونکی جائے گی۔ اب وہ ٹکراؤ ہے۔ اس کے ذریعے ایک نہایت قلیل سی تعداد والی' کمزور سی' بے بس سی' بے کس سی' مہاجر سی' ایک جماعت میں' اتنی توانائیاں عطا کی گئیں کہ انہوں نے قیصر ❶ و کسریٰ ❷ جیسی سلطنتوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہ سلطنتوں کی تباہی نہیں ہے' یہ ان

---

❶ قیصر: شاہ روم کا لقب۔ واضح رہے زبان رومی میں قیصر اس بچے کو کہتے ہیں جس کی ماں اُس بچے کے جننے کے دنوں میں مرجائے اور پھر اس عورت کا پیٹ چاک کر کے وہ بچہ نکالا جائے۔ چونکہ پہلا بادشاہ روم کا اغسطوس نامی اسی طرح سے پیدا ہوا تھا اس لیے اس کا خطاب قیصر ہوا۔ اُس روز سے اب ہر بادشاہ روم کا لقب ہوگیا۔ (حوالہ: لغات کشوری' ص ص۔ 374 -373)۔

❷ کسریٰ: شاہانِ عجم کے ہر بادشاہ کا لقب۔ فارس اور مدائن کے بادشاہوں کا لقب۔

کے غلط نظام کی شکست وریخت ہے۔

قرآنِ حکیم کا فلسفہ تاریخ

میں پھر عرض کردوں کہ قرآن کا فلسفہ تاریخ یہ ہے کہ اقوام کی تباہی کا باعث ان کا غلط نظام تھا اور وہ غلط نظام ملوکیت کا تھا: انسانوں کا انسانوں پر حکومت کرنا۔ قرآن کی رو سے سب سے بڑا جرم یہ ہے جس کا نتیجہ سب سے بڑی تباہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان پہ حکومت کرے۔ تو کہا کہ اس کے بعد کیا ہوگا: وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (69:14)[1]۔ یہاں اگر مراد طبعی دنیا سے ہو تو اس کا عام ترجمہ یہ کیا جائے گا جیسا کیا جاتا ہے کہ جب زمین کو اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا اور ایک ہی مرتبہ وہ توڑ دیئے جائیں گے۔ یہاں میں ایک چیز عرض کروں کہ یہ واقعات جو خارجی دنیا میں ہونے کے ہیں' صحیح ہیں۔ سائنسدان تو اب آہستہ آہستہ اس نتیجے پہ پہنچ رہے ہیں کہ ایک دن یہ کرّے ٹکرائیں گے' پاش پاش ہو جائیں گے' تاریکیاں چھا جائیں گی۔ یہ ٹھیک ہے لیکن یہ ایک Scientific (سائنسی) معلومات کی بات ہے کہ ایسا ہوگا۔ ہمارے اعمال کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے کہ آج سے کروڑ سال کے بعد یہ زمین پھٹ جائے گی اور ستارے ٹوٹ جائیں گے' مجھ پہ اس کا کیا اثر ہے؟ اور اس زمانے میں جو لوگ ہونگے بھی اگر یہ ساری زمین تہس نہس ہو جائے گی' وہ بھی ساتھ تہس نہس ہو جائیں گے۔ اصل چیز جو قرآن کا پیغام ہے وہ اس کی تعلیم ہے اور تعلیم کا تعلق زندگی سے ہے' خواہ فرد کی زندگی ہو یا اقوام کی زندگی ہو۔ اس لیے میں ان انقلابات کو' جہاں تک قرآن اس کی تائید کرتا ہے' قوموں کی زندگی سے ہی متعلق سمجھتا ہوں۔ اس کی تائید عربی زبان کے الفاظ کے مجازی معنی کرتے ہیں' جو ان کے ہاں کے لغت میں' ان کی زبان میں' موجود ہیں۔ میں نے اپنے لغات القرآن میں ان کی تائید اور سند سے معنی دیئے ہیں۔ یاد رکھیے قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے کسی لفظ کے جو معنی ہمارے جی میں آئیں' ہم وہ معنی کر دیں۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ ان معنی میں عربی زبان کی سند حاصل ہونی چاہیے۔ قرآن کی جو کلی تعلیم ہے اس کے اندر ان معنی کو fit in (موزوں) ہونا چاہیے۔

قرآنی الفاظ کا مفہوم متعین کرنے کا طریق

عزیزانِ من! میں یہ عرض کردوں کہ میں نے ساری عمر' اور ساری عمر سے مراد' اب قریب پچاس سال کا عرصہ

---

[1] ایک ہی حملہ میں' سردارانِ قوم اور ان کے لاؤلشکر (الجبال) کی سرکشی اور تکبر کا بھرکس نکال کر رکھ دیا جائے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوچلا ہے' قرآنِ کریم پر' وہ اتنی سی تو کتاب ہے' پچاس سال کے عرصے میں اس پہ غور کیا ہے۔ اس کا طریقہ یہی تھا کہ اس کے الفاظ کے وہ معنی لیے جائیں جو عربوں کے ہاں زمانہ نزولِ قرآن میں مستعمل تھے۔ اس کی سند وہاں سے حاصل ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ جس طرح سے میرا جی چاہے میں نے معنی پہنا دیئے اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں جہاں ان الفاظ کا استعمال کیا ہے' اس کی تائید حاصل ہونی چاہیے۔ اب یہاں جوارض اور جبال آیا ہے'۔ اس کے جو لفظی معنی لیے جائیں گے' تو ان میں ارض زمین کو کہیں گے اور جبال پہاڑوں کو کہیں گے لیکن اس آیت میں یہ معنی fit in (موزوں) نہیں ہوتے۔ یہاں قومِ ثمود' عاد اور نوح کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے اکابرین کو پہلے **حملت** کہا۔ بڑے بڑے سردارانِ قوم کہا گیا ہے۔ ان کے ہاں بڑے بڑے صاحبِ قوت و اقتدار تھے۔ اُن کا ذکر چلا آ رہا ہے کہ وہ کس طرح تباہ ہوئے۔ اس کے فوری بعد یہ بات کہنا کہ یہ زمین پھٹ جائے گی' یہ پہاڑ ٹوٹ جائیں تو اِن میں ربط نہیں مل رہا۔ اسی زبان میں ارض اور جبال کے یہ معنی موجود ہیں۔ ''**حـــمـــلـــت**'' کے معنی ہوتا ہے کسی کو اپنی جگہ سے دھکا دے کر ہٹا دینا۔ ''ارض'' پست لوگ ہوتے ہیں اور ''جبال'' جن کے کھونٹے پہاڑوں کی طرح گڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ یہ ان الفاظ کے مجازی معنی ہیں۔ یعنی وہ اس قدر محکم ہیں کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمیں اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا ہے۔ ''ارض'' اتنے پست کہ وہ بیچارے روندے ہی جائیں' ان کو کبھی یہ توقع ہی نہ ہو کہ ہم بھی سر اٹھا سکیں گے۔

عزیزانِ من! اب دیکھیے قرآن تین لفظوں میں یہ کیا بات کہہ گیا ہے کہ اس کے بعد وہ ٹکراؤ جو ہونے والے ہیں' ان سے ان کمزور قوم کے بے جان پیکروں میں توانائیاں پھونکی جائیں گی۔ آگے یہ ہے کہ ان پست لوگوں یعنی ارض کو جنہیں یہ روندتے ہوئے چلے جا رہے ہیں' اپنی جگہ سے ''ہلا دیا'' جائے گا۔ ان کے ہلانے کے معنی ہیں ''اونچا کر دینا''۔ کہا کہ پہاڑوں کی طرح جو اپنے آپ کو مستحکم سمجھتے تھے' ان کو اپنی جگہ سے ہلا دینا' انکا اقتدار چھین لینا ہے' ان کی قوت چھین لینا ہے۔ کہا یہ ہے کہ اب جو انقلاب یعنی ''الحاقۃ'' آنے والا ہے' اس میں ان کو جو بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح اپنے آپ کو محکم اور مستحکم سمجھتے تھے' بنیادوں تک ہلا دیا جائے گا اور یہ جو پستیوں کے گڑھوں میں گرے ہوئے ہیں ان کو اٹھا کے سربلند کر دیا جائے گا اور یہ ایک دم ایسا ہلا بولے گا کہ یہ جو پہاڑوں جیسے مستحکم بنے پھرتے ہیں' وہ ٹکڑے ٹکڑے' پاش پاش کر کے رکھ دیئے جائیں گے۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ **فَيَوْمَئِذٍ وَّ قَعَتِ الْوَاقِعَةُ** (69:15) یہ ہے وہ دن جس دن وہ واقعہ ہوگا' جس کا ذکر ہم شروع میں کر آئے ہیں کہ وہ چیزیں جو آج محض نظری طور Theoratically' تمہارے سامنے آ رہی ہیں' وہ ایک حقیقت بن کر تمہارے سامنے آ جائیں گی۔ کیا انداز ہے قرآن کا!

عزیزانِ من! کلمۃ اللہ کے متعلق وہ ان سے کہتا جا رہا ہے کہ یہ خدا کا قانون یعنی کلمۃ اللہ ہی غالب رہے گا۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ قرآن نے سنۃ اللہ بھی کہا ہے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (48:23) ❶۔کلمات لفظی معنوں میں، نظری طور، یہ In Theory قانون ہوتے ہیں۔ جب تک یہ In Theory (نظری طور پر) رہتے ہیں، وہ کلمہ کہلاتے ہیں اور جب وہ عمل میں آجاتے ہیں تو وہ سنت کہلاتے ہیں۔ یعنی جب محسوس شکل میں اس کے نتائج سامنے آئے اسی کلمہ کو تو سنت اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو خدا کے قانون کا عملاً سامنے آجانا کہلاتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس قانون نے اپنا نتیجہ مرتب کر دیا ہے۔ اسے Pragmatic Test (عملی آزمائش) کہتے ہیں۔

قرآنی لفظ سماء کا مفہوم

یہ ہے وہ واقعہ جو الحاقہ کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اسی لیے کہا کہ وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ❷ (69:16)۔ عزیزانِ من! کیا لفظ ہے سما! اگر سما کے معنی آسمان لیے جائیں گے تو آسمان کوئی شے ہے ہی نہیں، یہ تو حدِ نگاہ ہے۔ یہ جو فضا کے کرّے ہیں، آپ انہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ سما ہیں لیکن پھر وہی بات ہے کہ اس ربط کے اندر یہ معنی فٹ ان (Fit- In) نہیں ہوتے۔ سماء کے معنی ہی بلندیوں پر اٹھے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو طرہ باز خان سمجھتے ہیں یعنی ایسے جو کسی کو اپنی خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کی یہ کیفیت لفظ واھیۃ نے واضح کر دی۔ واھیۃ کے معنی ہوتے ہیں ''وہ بندشیں، جن کے ساتھ بندھے ہوئے کوئی مضبوط اور محکم ہوتا ہے، ان بندشوں کو ڈھیلا کر دینا۔'' یہ جو بڑے بڑے بنے پھرتے ہیں، یہ تنہا نہیں ہوتے، ان کے بہت سے ذرائع اور اسباب ہوتے ہیں جو انہوں نے اپنے ساتھ بڑی محکمیت سے، بڑی مضبوطی سے، باندھ رکھے ہوتے ہیں۔ وہ ان کی قوت اور اقتدار کے اصلی سبب ہوتے ہیں۔ آپ قرآن کا ایک ایک لفظ دیکھیے۔ یہاں لفظ آیا ہے واھیۃ کہ ان کی بندشیں ڈھیلی کر دی جائیں گی، وہ جن ذرائع اور اسباب کی بناء پر اتنے محکم بنے پھرتے تھے، وہ بندشیں ڈھیلی ہو کر کمزور ہو جائیں گی۔

عرش کا مفہوم

عزیزانِ من! آگے ایک بات ہے جس کا مفہوم ابھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے۔ کہا کہ وَالْمَلَكُ عَلٰى

---

❶ اور خدا کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں، ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اس وقت ہر سر بلند، متکبر کی قوت پاش پاش ہو جائے گی اور ہر مستبد کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔

اَرْجَآئِهَا وَ یَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّکَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَةٌ ❶ (69:17)۔خدا کے عرش کے معنی یہ نہیں کہ کوئی کسی قسم کا تخت ہے خواہ وہ لکڑی کا بنا ہوا ہو یا تختِ طاؤس ہو۔ خدا کے لیے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اس قسم کے تخت پر بیٹھا ہو گا۔ روایات کی رو سے جو عرش کا مفہوم ہے وہ کئی دفعہ سامنے آ چکا ہے۔ وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پہاڑی بکروں کے سینگوں کے اوپر خدا کا وہ تخت ہے اور پھر جب خدا اس پہ بیٹھتا ہے تو اس میں سے ایسے چرچر کی آواز نکلتی ہے جیسے اونٹ کے بیٹھتے وقت آواز نکلتی ہے۔ یہ ہے جو احادیث کے اندر عرش کے معنی دیئے ہوئے ہیں۔ یہ معنی اس خدا کے متعلق ہیں جو کہتا ہے کہ هُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (57:4) تم جہاں بھی ہو ہم تمہارے ساتھ ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! عرش کے معنی اقتدار کا Centre (مرکز) ہوتا ہے' پورا کنٹرول ہوتا ہے۔ خدا نے یہی کہا ہے کہ ااس نے کائنات کو پیدا کیا اور اس کارگہ کائنات کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ❷ (7:54)۔ یہاں استویٰ کا لفظ آیا ہے۔ استویٰ کے معنی ہوتا ہے ''لغزش کھانے سے محفوظ رہنا' اپنی جگہ سے نہ ہلنا یعنی اس میں لغزش کھانے یا اپنی جگہ سے ہلنے کی یہ بات نہیں ہوگی' اس میں خدا کا کنٹرول ❸ ہے' کسی قسم کی جھول یا بندش کا ڈھیلا پن نہیں ہوگا۔'' یَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰی مِنْکُمْ خَافِیَةٌ (69:18) اس دن تم سب نکھر کر سامنے آ جاؤ گے' تمام راز فاش ہو جائیں گے اور پھر تمہاری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہے گی۔

ہر سانس میں قیامت موجود ہے

آپ اسے' خواہ اس دنیا میں جو قوموں میں انقلاب آتا ہے' وہ یومِ حساب لے لیجیے یا مرنے کے بعد کی زندگی کا یومِ حساب لیجیے' مگر یومِ حساب یہاں بھی ہوتا ہے' ہر آن ہوتا رہتا ہے' ہر سانس میں انسان میں قیامتِ موجود ہے۔ ویسے یہ موت بھی یکا یک نہیں آتی۔ اگر ایکسیڈنٹ ہو جائے تو یہ اور چیز ہے ورنہ طبعی موت بھی یکا یک نہیں آتی۔ ہر سانس میں انسان یا تو زندگی پیدا کرتا ہے یا موت کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ طبعی موت بڑی Gradually آتی ہے' بتدریج آتی ہے' فوراً نہیں آتی۔ یہ حساب ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح سے قوموں کا حساب ہوتا ہے۔ وہ قوم ایک ہی دن میں نہیں گر جاتی' وہ

---

❶ اور کائناتی قوتیں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوں گی اور خدا کے نظامِ ربوبیت کا مرکزی کنٹرول آٹھ شعبوں میں بٹا ہوگا۔

❷ پھر اس (کائنات کی پستیوں اور بلندیوں) کا مرکزی کنٹرول خود اپنے دستِ قدرت میں رکھا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)۔

❸ امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ اِسْتَوٰی عَلٰی میں کسی غلبہ وتسلط کا مفہوم ہوتا ہے۔

بڑی آہستہ آہستہ' بتدریج زوال کیطرف جاتی ہے۔ مغلیہ سلطنت اتنی جاہ وحشمت کی سلطنت تھی۔ اس جیسی دنیا میں کسی نے کم دیکھی ہوگی۔ ایک برِاعظم کے اوپر یہ حکومت سینکڑیوں سال' صدیوں تک' رہی۔ اس کے بعد تاریخ لکھنے والے یعنی مورخ کہتے ہیں کہ جی! اورنگ زیب (1618-1707) کے بعد جو زوال ہوا تو اس کے بعد بھی اس نے آخری دیا گل ہونے کے وقت تک قریباً ڈیڑھ سو سال لے لیا' تو یہ انقلاب Gradually (بتدریج) آہستہ آہستہ' ایک Accumulative Effect ہوتا ہے' اجتماعی اثر ہوتا ہے' جس سے پھر وہ قوم موت کی طرف چلی جارہی ہوتی ہے اور پھر ایک دن وہ گر جاتی ہے۔

ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوکر رہتا ہے

قرآن' قوموں کو اس دوران میں جب وہ بتدریج اپنی تباہی کی طرف جارہی ہوتی ہیں' وارننگ دیتا ہے کہ سنبھل جاؤ تو بچ جاؤ گے' ورنہ گڑھے میں گر جاؤ گے۔ یہ ہے وہ حساب جو ہوتا رہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس مجموعی اثر کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے انسان اپنے آپ کو بھی دھوکا دے سکتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں چھیڑ نہیں سکتا' کوئی نہیں ہلا سکتا۔ وہ دوسروں کو بھی دھوکا دے سکتا ہے کہ وہ جو کچھ اپنے آپ' فریب سے' غصب سے' استحصال سے' کر رہا ہے' اس کے بارے میں کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ اس کے متعلق خواہ کچھ معنی ہی پہنا دے کہ یہ ہم سب کچھ تمہارے فائدے کے لیے' قوم کے فائدے کے لیے' ملک کے فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ قرآن نے کہا کہ جب وہ انقلاب کی گھڑی آتی ہے تو پھر کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہتی۔ مشکل یہ ہے کہ اربابِ اقتدار کا استبداد ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی کو اصلی بات کہنے ہی نہیں دیتے۔ آپ دیکھیے ان کے مرنے کے بعد جو تاریخیں لکھی جاتی ہیں' دیکھیے کس طرح ان کے حساب سامنے آتے ہیں۔ پھر تو ایک ایک شخص اپنے ہاتھ میں کاغذ لیے بولتا چلا جاتا ہے کہ اس نے یہ بھی کیا تھا' اس نے وہ بھی کیا تھا۔ یہ تو عام حالات میں ہے اور قرآن کہتا ہے کہ کوئی بھی بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ اب یہ دیکھیے کہ آگے دو قسم کے گروہ آتے ہیں۔ میں پھر عرض کروں کہ آپ اس دنیا میں قوموں کے زوال کو لیجیے یا آخرت کی زندگی کو لیجیے۔ بات یہی ہے۔ ان دو گروہوں میں سے پہلے ایک گروہ کے بارے میں کہا کہ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَئُوْا کِتٰبِیَهْ ❶ (69:19)۔

---

❶ جس کے اعمال کا رجسٹر' یمن وسعادت کے ہاتھوں میں ہوگا' وہ ہر ایک سے خوشی خوشی کہے گا کہ لو! میرا نامۂ اعمال پڑھو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)۔

بڑے خوبصورت الفاظ اس آیت میں آئے ہیں۔ دایاں ہاتھ عربی زبان میں یمین ہے۔ یا اس کے لیے یمن و سعادت کا لفظ ہے۔ یہ ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بابرکت یا سعادت مند کے لیے یمن کہتے ہیں۔ یہاں سے دایاں ہاتھ یمین ہوتا ہے جو برکت وسعادت کے لیے ہے اور ''شمال'' بایاں ہاتھ ہوتا ہے۔ اسے محاورے کے اعتبار سے منحوس کہتے ہیں تو ان کے عربی زبان کے محاورے کے اعتبار سے یہ کہا گیا ہے کہ جس کا حساب کا کاغذ' جو اس کی Account Book ہوگی' اس کے یمن وسعادت کے ہاتھ میں ہوگا' وہ سب کو دکھاتا پھرے گا کہ لو! میرا نامۂ اعمال پڑھو۔ آپ دیکھیے کہ اس کے بعد کیا کہا ہے؟ کہ یہ کہے گا جب یہ رزلٹ آؤٹ ہوتا ہے تو لڑکوں کو وہ رزلٹ کی چٹ ملتی ہے۔ ان میں یہ دیکھیے کہ جو فسٹ ڈویژن میں ہو یا جو فسٹ آیا ہو' اس بچے کی کیفیت ذہن میں رکھیے کہ وہ ہال کے کمرے سے ناچتا کودتا ہوا نکلتا ہے اور ہر ایک کو دکھاتا ہے کہ یہ دیکھو تو سہی' میں نے اتنے نمبر حاصل کیے۔

خوشی اور مسرت کا دارومدار

قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جس کے یمن وسعادت کے ہاتھ میں اس کا اکاونٹ ہوگا وہ سب کو دکھاتا پھرے گا: ارے دیکھو! میرا حساب دیکھو! میرا حساب دیکھو!!! یہ کیا الفاظ ہیں: او دیکھو تو سہی میرا حساب! یہ کیوں ہوا؟ اس نے ایسے عمدہ نمبر کیوں حاصل کیے' یہ آج کیوں اتنا خوش ہے کہ ہر ایک کو دکھاتا ہے کہ میرا حساب دیکھیے؟ اس لیے کہ اِنِّیۡ ظَنَنۡتُ اَنِّیۡ مُلٰقٍ حِسَابِیَهۡ (69:20) راز کی بات یہ ہے کہ یہ کہے گا کہ یہ اس لیے ہوا کہ مجھے یقین تھا کہ میں نے ایک دن کسی کو حساب دینا ہے۔ بس یہ ہے' عزیزانِ من! غلط اور صحیح نظام کی بات۔ جس نظام میں اربابِ اقتدار کو یہ یقین ہو کہ ہم نے اپنے سے اعلیٰ ایک ہستی کے سامنے حساب دینا ہے یا یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' یہ یونہی رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ یہ نتیجہ برآمد کرے گا۔ تو وہ شادکام رہتے ہیں۔ اب یہ معنی ہوگئے۔ کیا انداز قرآن کا ہے کہ وہ کودتا' ناچتا' رقصاں' فرحاں وشاداں' ہر ایک کو اپنا حساب دکھائے گا اور آگے بات بتادی کہ وہ کہے گا کہ میں نے اس لیے اتنے اعلیٰ نمبر حاصل کیے کہ مجھے پتہ تھا کہ ایک دن امتحان ہونا ہے اور پرچے ملنے ہیں اور اس کا نتیجہ نکلنا ہے۔ یہ ہے ایمان بالآخرۃ۔

آخرت کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہ مرنے کے بعد کی زندگی ہی آخرت نہیں ہے' ہر Future (مستقبل کا لمحہ) آخرت ہے' ہر کل آنے والا دن' آخرت ہے اور وہ نبی اکرم ﷺ کی چمکتی دمکتی ہوئی حدیث ہے کہ جس شخص کا آج کا دن اس کے کل کے دن

سے زیادہ ترقی یافتہ نہ ہوا' سمجھ لو کہ وہ تباہ ہو گیا۔ الفاظ تو یہ ہیں کہ جس کے یہ دو دن ایک جیسے ہوئے وہ برباد ہو گیا۔ فھو مغبون یعنی حرکت اور ترقی کی پیمائش کی کیفیت حضورؐ نے یہ فرمائی کہ تمہارا ہر قدم' ہر نیا دن' پچھلے دن سے آگے ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہا کہ جس کا وہ دن پہلے دن سے پیچھے ہوا۔ اگر وہ دن پہلے دن جیسا بھی رہا تو تباہ ہو گیا۔ زندگی تو حرکت اور ترقی چاہتی ہے' ہر سانس میں آگے بڑھنے کی بات ہونی چاہیے۔ اگر کسی کے دو دن بھی ایک جیسے ہو گئے اور اس نے آنے والے دن میں پچھلے دن کے مقابلے میں ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھایا' وہ تباہ ہو جائے گا۔ اور جہاں صورت یہ ہو کہ یہ بات کہی جائے کہ ہزار سال پہلے جہاں قوم تھی وہاں جاؤ تو پھر تمہاری ترقی ہو گی۔ تو بتاؤ تو سہی کہ یہ کیا ہے؟ عزیزانِ من! اسے Fundamentalism (بنیاد پرستی) کی تاریخ کہتے ہیں اور آپ کے ہاں کا سارا مذہب یہی کہتا ہے' تمہارے بڑوں نے بھی یہی کیا تھا' تمہارے اسلاف نے بھی یہ کیا تھا ہمیں تو ہزار برس پہلے' پیچھے جا کر ان کا اتباع کرنا چاہیے' اور یہ سنتِ رسول اللہؐ کے مدعی ہیں۔

حضور ﷺ کی چمکتی ہوئی حدیث

عزیزانِ من! اس طرح کی حدیثیں یہ کبھی پیش نہیں کریں گے کہ ہزار سال تو ایک طرف' حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس قوم کا گزرا ہوا کل' اس کے آج کے برابر ہے' اس سے آگے نہیں بڑھا ہے' وہ قوم تباہ ہو جائے گی۔ اللہ اکبر! یہ تھی تعلیم اور کس قدر صحیح کہا تھا شاعرِ مشرق' مفکرِ اسلام' مفکرِ قرآن' ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہ

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

قرآن کہتا ہے کہ بس ایک ہی بات کہی گئی ہے کہ اِنِّیۡ ظَنَنۡتُ اَنِّیۡ مُلٰقٍ حِسَابِیَهۡ (69:20) مجھے یہ یقین تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں' ایک دن اس کا نتیجہ نکلنا ہے۔ جس نے یہ ذہن میں رکھ کر کام کیا فَهُوَ فِیۡ عِیۡشَةٍ رَّاضِیَةٍ (69:21) اس کی زندگی خوشگواریوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو گی' اس کی آرزوؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہو گی۔ اِس سے اگلی ہی آیت میں کہا ہے کہ فِیۡ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ (69:22)۔ عزیزانِ من! جنت قرآن کی تشبیہ ہوتی ہے: یہ وہ زندگی ہے جس میں ہر قسم کی آسائشیں' سہولتیں' اطمینان' سکون' حاصل ہو۔ وہ اس قسم کا باغ جنتی زندگی ہے۔ عالیہ کہہ کے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ باغ بلندیوں کی طرف جانے والا ہے' وہ Hanging Garden ہوتے ہیں۔ اس کے تختے اوپر کی طرف جانے والے

ہیں۔ہم نے وہ کشمیر میں دیکھے: جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (69:22) اوپر کی طرف جو جنت کے تختوں کے بھی اوپر ترین جو تختہ ہے' یعنی سب سے بلند تختہ۔اس کے اندر آگے دو لفظ ہیں۔جن کا سمجھنا ازبس ضروری ہے۔

صرف دو لفظوں میں قرآن کے معاشی نظام کا نقشہ

عزیزانِ من! کہا کرتے ہیں کہ قرآن کا معاشی نظام کیا ہے۔قرآن کے الفاظ پہ اگر بات سمجھ میں آ جائے تو انسان وجد میں آ جاتا ہے کہ اس ایجاز کے ساتھ' اس اختصار کے ساتھ' دو لفظوں میں قرآن نے آپ کا پورا معاشی نظام بتا دیا۔آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔دو لفظوں میں بتایا کہ ان کی زندگی آسائشوں کے جھولے جھولے گی' وہ باغات کے بلند ترین تختوں پر ہونگے' اور وہ باغات' وہ زندگی' وہ نظام ہے جس میں کہا ہے کہ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ❶ (69:23)۔معاشی زندگی کے لیے دو ہی چیزیں چاہئیں۔پیداوار بہت زیادہ ہو۔یہ پہلی بات ہے مگر یہ تو سیکولر نظام بھی کر لے گا' سرمایہ داری کا نظام بھی کر لے گا' کیوں کہ اس میں ساری تگ و تاز اسی کے لیے ہے کہ پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو' اس زیادہ سے زیادہ پیداوار نے ''اوناں سبزیاں دا بیڑہ غرق کر کے رکھ دتا' جیہڑ یاں روز کھانے آں اسیں''۔ ❷

زیادہ سے زیادہ پیداوار' یہ ہے نظامِ سرمایہ داری۔قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ ایسے درخت ہوں جن کے پھلوں کے گچھے بھرپور پھل دیں گے۔یہ بھی ضروری ہے اور اگلی بات وہ ہے جہاں قرآن کا نظام آتا ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (69:23) اس قدر بھرپور پھلوں کے گچھے ہوں گے جو ہر شخص کی دسترس میں ہوں گے۔

دسترس کے اس ایک لفظ نے قرآنی نظام کی وضاحت کر دی

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔یہاں نظر آتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ڈیڑھ ہزار سال پہلے تشبیہاً جنت کا ذکر آ رہا ہے۔ایسا معاشی نظام دیا ہے جس پہ اب کوئی اضافہ ہی نہیں کر سکتے۔کہا ہے کہ قُطُوْفُهَا (69:23) زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو اور اس کے بعد یہ ہے کہ وہ دَانِيَةٌ (69:23) پیداوار ہر شخص کی دسترس میں ہو۔وہ پھلوں کے گچھے خود جھکے ہوئے ہوں کہ ہر شخص جا لے۔

---

❶ جس کے پھل ہر وقت اُن کی دسترس میں ہوں گے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)۔

❷ ان سبزیوں کا بیڑا ہی غرق کر کے رکھ دیا جو ہم روز کھاتے ہیں۔

جنتِ ارضی میں ایک ہاتھ بھی محروم نہیں ہوگا

جس پیداوار میں' خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہو' اگر کوئی ایک ہاتھ بھی اس سے محروم رہ گیا' تو وہ جنت نہیں' جہنم ہے۔قرآنِ کریم نے جنتی نظام کی بات کی ہے۔عزیزانِ من! اب تو میرا خیال ہے' آپ کے قلوب کو بھی وجد آ جانا چاہیے۔ یہاں دو لفظ آئے ہیں۔زیادہ سے زیادہ پیداوار' پھلوں کے لٹکے ہوئے گچھے' اور ان کی شرط یہ ہے کہ وہ ہر ایک کی دسترس میں ہوں' اس میں ہر ایک کا حصہ ہو۔وہاں ایسا لفظ استعمال ہوا ہے کہ وہ خود جھک کر اس کیطرف آ جائیں' اسے ایڑیاں اٹھا کر اس تک ہاتھ بھی نہ لے جانا پڑے' وہ خود جھک کر اس کی طرف آ جائیں۔میرے اللہ! عزیزانِ من! دنیا کے کسی لٹریچر میں یہ دو لفظ لائیے: پیداوار تو اتنی زیادہ ہو اور اس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ محروم تک' محتاج تک' خود جھک کے آ جائے' ہر ایک کی دسترس میں ہو جائے۔یہ ہے وہ جنتی نظام جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ **كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ** (69:24) کھاؤ پیو' استعمال کرو' آسائشیں اٹھاؤ' یہ سب ان اعمال کا نتیجہ ہے جو تم نے سابقہ ایام میں کیے تھے۔

حال ماضی کا ہی نتیجہ ہوتا ہے

یہ سب کچھ کیسے مل گیا؟ ہر پیداوار جو آج کھیتی ہوتی ہے' ماضی میں' Past میں' وہ کسان کی محنت کا ثمر ہوتی ہے' اس کے لیے کسان محنت کرتا ہوا چلا آتا ہے۔پھر آ کر اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے۔اسی طرح اگر آپ ہر باغ کی مثال لیں گے تو اس کی بھی یہی کیفیت ہے۔ماضی میں جو کچھ کیا ہوا ہوتا ہے' حال میں اس کے نتائج سامنے آتے ہیں۔آپ اندازہ لگائیے کہ یہ جنت بخششیں کی جنت نہیں ہے' یونہی کسی قوم کو انعام کے طور پہ نہیں ملتی۔کہا کہ کیسے یہ اتنے اتنے بڑے پھلدار درخت آ گئے' اتنی بہتات آ گئی کہ ان سے کہا جائے گا کھاؤ پیو۔یہاں لفظ آیا ہے: **هنيئًا**۔لفظ **هنيئًا** بڑا خوشگوار ہوتا ہے' کھاؤ پیو۔**بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ** (69:24) ارے یہ تو تمہاری اسی محنت کا نتیجہ ہے جو تم نے پہلے کی تھی۔اپنی محنت کے نتیجے میں' جو ماضی میں کی تھی' اس کے نتائج حال میں سامنے آتے ہیں۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن قوموں کے کیا انقلابات بتا رہا ہے۔یہ چیز نہیں ہے کہ بیٹھے بٹھائے یہ باغ اگ کھڑا ہوا اور اس میں وہ پھل بھی آ گئے اور تم آرام سے بیٹھے ہوئے ہو' لیٹے ہوئے ہو' اور پھر یہ جھک کے تمہارے منہ میں آ جائے گا۔اور پھر تم اس کا ایک ایک دانہ بڑے مزے سے کھا رہے ہو' نہیں' بات یہ نہیں ہے۔اصل تو یہ ہے کہ **الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ** (69:24) تمہارے وہ دن جو پہلے گزرے ہیں' ان

میں تم نے جو کچھ کیا تھا' یہ اس کا نتیجہ ہے جو ایسے تمہارے ہاں آ رہا ہے۔ یہ ماضی ہے' جو حال بنتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ بات کسی اور طرف نکل جائے گی' مگر میں کہوں گا کہ Present (زمانہ حال) جسے آپ حال کہتے ہیں' اس کا تو وجود ہی کچھ نہیں ہوتا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ جو حال ہوتا ہے' وہ ماضی کا ہی مستقبل ہوتا ہے' بعد میں آنے والا ہوتا ہے اور دوسری طرف مستقبل کا ماضی ہوتا ہے' پیچھے رہ جانے والا۔ زندگی تو صرف ماضی اور مستقبل ہے۔ کہا کہ جو تم نے ماضی میں اپنے لیے کیا تھا' یہ آج اس کا نتیجہ ہے۔ یہ ہے وہ جو یمن وسعادت والے ہیں۔ وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَهْ (69:25) وہ بچہ تو رزلٹ دکھانے کو رقصاں وشاداں وفرحاں آیا تھا اور جس کا رزلٹ بائیں ہاتھ میں ہوگا' وہ کہے گا کہ اے کاش! مجھے یہ رجسٹر نہ دیا جاتا۔ یہ عربوں کا محاورہ ہے کہ جس کا رزلٹ بائیں ہاتھ میں ہوگا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ کہے گا کہ یا اللہ! یہ رزلٹ ہی نہ نکلتا تھا تو اچھا تھا اور بیڑہ غرق ہو جاتا تو اچھا تھا۔

عزیزانِ من! مجھے بچپن کی بات یاد آ گئی ہے۔ جنگ عظیم (اوّل: 18-1914) کے دوران جب ہم وہاں پڑھا کرتے تھے تو مجھے اب تک یاد ہے کہ کچھ لڑکے جو بڑے نالائق ہوتے تھے' وہ روز یہ کہتے تھے کہ یا اللہ! جرمنی کو بھیج کہ وہ اس اسکول پہ بھی بم مارے۔ اب یہاں اس آیت میں یہی انداز ہے کہ اے کاش! یہ نتیجہ نہ مرتب ہوتا اور آگے ہے کہ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ (59:20) اور مجھے پتہ ہی نہ چلتا کہ میرے پیپر میں مجھے کتنے نمبر ملے ہیں۔ اگلی بات ہے کہ یٰلَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ (69:27) اے کاش! موت میرا کام تمام کر دیتی اور مجھے زندگی نہ ملتی۔ اس زندگی سے' جو حاصل ہوئی ہے' موت بہتر ہے۔' اس رزق سے موت اچھی ہے۔ یٰلَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ (69:27) اے کاش! کسی طرح موت میرا قصہ تمام کر دیتی۔ ہمارے ہاں یہ جتنے لوگ ہیں' انہیں اپنے حساب کی کوئی فکر نہیں۔ ان سب کا یہی یقین ہے کہ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے' اس کے بعد تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔

موت پر یقین کا نتیجہ

عزیزانِ من! کسی ایک دن بھی یہ یقین ہو جائے کہ موت کے بعد بھی مجھے ان چیزوں کا حساب دینا پڑے گا جو میں آج کر رہا ہوں تو پھر آدمی انہیں کبھی بھی نہیں دہراتا۔ وہ تو غم سے مر جاتا ہے جس کو یہ پتہ چل جائے کہ میں نے فیل ہونا ہے اور فیل ہونے کے بعد جو ناکامی میرے حصے میں آنی ہے۔ یہ ہے وہ جو قرآن کہتا ہے۔ یہ قومیں جو تباہ ہو جاتی ہیں' اس لیے ہوتی ہیں کہ ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں' اور جو کہے کہ صاحب! اس زندگی میں اگر تم بچ بھی

جاؤ گے تو زندگی تو آگے بھی چلے گی' وہاں پکڑے جاؤ گے' تو ان کو یہ یقین نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں' موت انسان کو ختم کر دیتی ہے۔ اور یہاں الفاظ ہیں جن کے معنی ہیں کہ اے کاش! موت میرا خاتمہ کر دیتی۔ مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَہْ o هَلَکَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَہْ ❶ (69:28-29)۔ دو ہی چیزیں ہوتی ہیں: مال و دولت کے زور پر اقتدار اور پھر اقتدار کے زور پر قوت۔ یہاں کہا ہے کہ وہ اس دن کہے گا کہ نہ وہ مال و دولت میرے کسی کام آئی اور نہ وہ اقتدار ہی کسی کام آیا۔

قرآنِ حکیم کا محاکاتی انداز

میں کہہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم میں قوموں کے ہی عروج و زوال کی داستانیں بیان ہوئی ہیں۔ یہ غلط اور صحیح نظام کے انجام کی باتیں بیان ہو رہی ہیں۔ اس کے بعد اگلی آیات میں ایسا انداز آ رہا ہے جیسا کہ وہ مجرم کو ہتھکڑیاں پہناتے ہیں' جیل کی طرف لے جاتے ہیں۔ قرآن کا اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ان چیزوں کو محاکات کے انداز میں بیان کرتا ہے یعنی ایسی محسوس شکل میں جو سامنے آ جائیں۔ کہا کہ خُذُوْہُ فَغُلُّوْہُ (69:30) وہاں عدالت سے ایسا حکم ملا ہے کہ اس کو ہتھکڑیاں لگاؤ۔ بیڑیاں اور زنجیریں پہنا دو۔ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْہُ ❷ (69:31) اور لے جاؤ کھینچ کے اس کو۔ قرآن یہاں لفظ جحیم لایا ہے جب کہ قرآن میں جہنم کا لفظ بھی تھا۔ جہنم تو وہ ہے جہاں انسانیت جلائی جاتی ہے' وہ انسانیت سوز مقام ہے اور جحیم وہ ہے جہاں حرکت رک جائے' وہیں کا وہیں کھڑا رہ جائے' آگے قدم نہ بڑھ پائے۔ وہ وہی ہے جو حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جس کے دو دن برابر ہو جائیں' وہ جحیم ہے' آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پھر کہا کہ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُکُوْہُ ❸ (69:32) یوں زنجیر پہنا دو' بیڑیاں ہتھکڑیاں پہنا دو۔ سوال یہ ہے کہ کیوں پہنا دو؟ غور سے سنیے' عزیزانِ من! آگے دو لفظ آتے ہیں' اس ''کیوں'' کا جواب مل رہا ہے' یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ کس قدر شدید عذاب ہے' کس قدر سنگین عذاب ہے' تباہ کن ہے۔ کیوں ایسا ہوا؟ اس کے جواب میں دو لفظوں میں بات آئی کہ اِنَّهٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ (69:33) یہ اپنے ہی بنائے ہوئے قواعد و قوانین پر یقین رکھتا تھا' خدا کے قوانین پر اس کو یقین نہیں تھا' یہ سب کچھ سمیٹے ہوئے تھا۔ اب سن لیجیے کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ یہ تو آپ نے دیکھا کہ یہ کتنا دردناک تباہ کن منظر ہے جس کو بتایا

---

❶ افسوس کہ وہ مال (جس پر میں اس قدر اتراتا تھا) میرے کسی کام نہ آیا اور میرا وہ غلبہ و اقتدار (جس کے بل بوتے پر میں نے اس قدر سرکشی اختیار کر رکھی تھی) غت ربود ہو گیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)۔

❷ پھر اسے دوزخ میں دھکیل دو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)۔

❸ اور وہاں اسے ایک لمبی زنجیر پہنا دو۔ (ایضاً)۔

گیا ہے: ہتھکڑیاں ہیں' بیڑیاں ہیں' جہنم ہے' آگ ہے۔ یہ کیوں ہوا؟

قوموں کی تباہی کے لیے ایک ہی جرم کافی ہے

عزیزانِ من! یہ اس لیے ہوا کہ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (69:34) یہ بھوکوں کو روٹی کھلانے کا انتظام نہیں کرتا تھا' ہر اس شخص کو روٹی کھلانے کا انتظام نہیں کرتا تھا جس میں کمانے کی سکت نہ رہی ہو' جس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو' جس کی کمائی اُس کی ضروریات پوری نہ کر سکے۔ یہاں یحض کا لفظ ہے: یہی نہیں ہے کہ یہ خود نہیں کرتا تھا' یہ دوسروں سے بھی نہیں کہتا تھا کہ اس کا ہمیں انتظام کرنا چاہیے۔ جرم دیکھ لیا۔ قرآن نے قوموں کی تباہی کا ایک ہی جرم گنایا ہے۔ مگر یہاں کہہ دیا جاتا ہے کہ جی! یہ قرآن کے معاشی نظام کو ہی لیے پھرتے ہیں' ان کے نزدیک روٹی کا ہی مسئلہ ہے' یہ جتنا بھی مسئلہ ہے' یہ Materialistic Concept (مادی تصور) ہے۔

یہ مادہ پرستانہ نظریہ ہے۔ ٹھیک ہے کیونکہ میاں صاحب کو بیٹھے بٹھائے جو مل جاتی ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ قرآن ایک ہی جرم گنا رہا ہے' وہ بھی بڑی شدید قسم کی سزاؤں کا صرف ایک جرم گنا رہا ہے کہ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ o فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ (69:34-35) آج ان لوگوں کا جنہوں نے روٹی کا انتظام نہیں کیا تھا' کوئی ولی' کوئی دوست نہیں ہے۔ بظاہر تو انہیں دوست' ساتھی' ووٹرز' بہت سے ملیں گے۔ جو محبت کے ساتھ' گرمجوشی کے ساتھ کسی کا دوست ہو' اس کے لیے یہ لفظ حمیم آتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی مخلص دوست نہیں رہتا۔ جس کی دولت ختم ہو جائے' جس کا اقتدار ختم ہو جائے' جو جہنم رسید ہو جائے' تو اس کا اس وقت ولی' دوست کون ہو سکتا ہے؟ کون اس کا ساتھ دے سکتا ہے؟ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ (69:36)۔ اس آیت کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ان کو کھانے کو غسلین ملے گا۔ غسلین کے معنی عام طور پہ لیتے ہیں: دھوون [1] کسی چیز کا' یا غسالہ' یا وہ پانی جس سے زخم دھویا گیا ہو' یا انتہائی گرم۔ اصل میں غسلین کے معنی ہوتے ہیں: آنسو' جو گرم گرم نکلتے ہیں۔ یہ وہ آنسو ہیں۔ اس لیے کہ کہا کہ ''اور کھولتے ہوئے پانی کے سوا (جس سے پیاس اور بھڑک اٹھے) کچھ پینے کو نہیں ملے گا۔ یہ اس کے اپنے ہی آنسوؤں کے گھونٹ ہوں گے۔ لَا یَاْکُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ (69:37) اس قسم کے جو مجرم ہیں یہ ان کی غذا ہو گی' انکا کھانا ہو گا۔ اس کے بعد وہ ہے جسے میں خدا کا تختِ جلال کہا کرتا ہوں۔ وہ عدالتیں آج ہمارے ہاں بھی ہیں خواہ وہ کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو۔ ہم ہی کہتے

---

[1] دھوون۔ وہ پانی جس میں کوئی چیز دھوئی گئی ہو اور اس میں کثافت آ گئی ہو۔

ہیں: ہماری عدالت سے‘ ہم ہمارے ہاں‘ بھی بولتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہوتی ہے کہ قرآنِ کریم ایسے مقام پر آ کر بھی ایک شہادت دیتا ہے کہ یہ جو کہا جا رہا ہے‘ اسے محض شاعری نہ سمجھو‘ یہ شاعری نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس شہادت کے لیے جو ''اقسم'' کا لفظ آتا ہے‘ جس کا ترجمہ ''قسم کھانا'' کیا جاتا ہے‘ اس ''قسم کھانے'' سے کیا مراد ہے؟

قسم کھانے سے کیا مراد ہے؟

عزیزانِ من! اس تک پہنچنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ قرآن کا اپنا انداز ہے۔ یہاں کہا ہے کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ o وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ❶ (69:38-39)۔ عمومی طور پر ہمارے ہاں ''اقسم'' کے معنی قسم کھانا کیے جاتے ہیں۔ مثلاً میں قسم کھاتا ہوں اس چیز کی: وَالتِّيْنِ o وَالزَّيْتُوْنِ o وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ (95:1-2) جب کہ عربی لغت کے لحاظ سے ''اقسم'' کا ترجمہ کسی چیز کو شہادت کے طور پر پیش کرنے کا ہے۔'' یعنی وہ چیزیں جو محسوس طور پر اور مشہود طور پر تمہارے سامنے آ چکی ہیں اور وہ جو ابھی آنے والی ہیں‘ میں ان تمام چیزوں کو اس اعلانِ عظیم کی شہادت میں پیش کرتا ہوں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (69:40) یہ جو تمہیں باتیں کہہ رہا ہے‘ جس کی زبان سے تم یہ سن رہے ہو‘ یہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا‘ یہ ہمارا پیغامبر ہے۔ کیا بات کہی ہے! یہ ہمارے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہے‘ تم ان پیغامات کو بڑا Lightly (معمولی سا) لے رہے ہو‘ Serious (سنجیدگی سے) نہیں لے رہے‘ غور نہیں کر رہے‘ تو کیا تم سمجھ رہے ہو کہ یہ شاعر ہے؟ ان کے ہاں شاعروں کو بھی کہا کرتے تھے کہ ان کو بھی الہام ہوتا ہے۔ یہ دیوی دیوتاؤں کیطرف سے آتے ہیں‘ لہٰذا ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی لیکن وہ شاعر ساری عمر شعر تو کہتا تھا‘ اپنی روٹی کما سکنے کے بھی قابل نہیں ہوتا تھا۔

شاعری میں فراق اور وصال کی حقیقت

عزیزانِ من! قرآن نے اسی لیے شاعر کی مذمت کی کہ ان کی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا‘ کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ قرآن نے کہا ہے۔ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (26:225) وہ اپنے خیالات کی دنیا کے اندر‘ کبھی وصال کی لذتیں گنا رہا ہے‘ کبھی فراق کے رونے رو رہا ہے‘ نہ فراق اصلی ہوتا ہے‘ نہ وصال اصلی ہوتا ہے‘ دونوں چیزیں شاعری ہوتی ہیں۔ یہاں کہا کہ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ (69:41) او‘ اس کو شاعری نہ سمجھ۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے بھی تو اپنے لیے

---

❶ (اے رسول! تم ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے‘ قیاسات نہیں‘ یہ اٹل حقائق ہیں جن پر) وہ واقعات جو محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ چکے ہیں اور وہ جو ابھی تک پردہ اخفا میں ہیں‘ شاہد ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)۔

یہی کہا ہے۔قرآنِ کریم کہتا ہے کہ قَلِیْلاً مَّا تُؤْمِنُوْنَ (69:41) یہ شاعری سمجھ کے گزر جاتے ہیں۔اس حقیقت پہ غور کر کے‘ اس پہ یقین نہیں رکھتے کہ یہ جو بات کہہ رہا ہے‘ وہ واقعی ہونے والی ہے۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (69:42) یہ پیشین گوئیاں کرنے والا‘ قسمت کے حال بتانے والا‘ تقدیریں بیچنے والا نہیں ہے۔قَلِیْلاً مَّا تَذَكَّرُوْنَ (69:42) تم اسی لیے اس کی بات پہ غور نہیں کرتے۔یہ بات نہیں ہے۔یہ کچھ کہہ رہا ہے اس کی بات غور سے سنو۔یہ ہمارا پیغامبر ہے۔اور تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (69:43) یہ قرآن نازل کیا ہوا ہے اس خدا کا جو تمام اقوامِ عالم کا رب ہے۔ربوبیتِ عالمین کے لیے یہاں قرآن کا انداز دیکھیے۔وہاں کہا تھا کہ یہ بھوکے اور مسکین کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے‘ یہاں اپنی صفت ہی یہ بتائی ہے کہ یہ اس خدا کیطرف سے ہے جو تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔یہ ہمارا پیغام پہنچا رہا ہے۔

وحی خداوندی میں کسی رسول کا اپنا ایک لفظ ہی شامل کرنا جرمِ عظیم ہے

عزیزانِ من! یاد رکھیے‘ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔اس کی تو کیفیت یہ ہے کہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ o لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ (69:44-45) پورے کا پورا اپنی طرف سے بنا کر کہنا تو ایک طرف اگر اس وحی میں یہ رسول‘ یہ پیغامبر‘ کوئی ایک بات بھی اپنی طرف سے ملا کے بتائے تو ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ (69:46) تو ہم اس کی اتنی سخت گرفت کریں۔’’وتین‘‘ کے معنی عام طور پر رگِ جان لیتے ہیں۔اس کے معنی وہ ذرائع ہوتے ہیں جس سے کوئی شے مستحکم ہو‘ طاقتور ہو۔کہا کہ ہم کاٹ کے رکھ دیں ان تمام ذرائع کو جن کی بناء پہ یہ ایسی جرأت کریں کہ یہ اپنی طرف سے کچھ کریں اور پھر اسے ہماری طرف منسوب کر دیں۔ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ (69:49) اور دوسرا کوئی ایسا نہ ہو جس میں یہ جرأت ہو سکے کہ ہمارا ہاتھ پکڑ لے کہ ہم ایسے نہ کریں۔کہا: یہ ہمارا پیغام ہے جو تمہیں پہنچا رہا ہے۔ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ (69:47) وہ لوگ جو احساس رکھتے ہیں‘ جو غلط اعمال اور غلط نظام کے انجام سے ڈرنے والے ہیں‘ ان کے لیے اس میں بڑی وارننگ ہے‘ بڑی نصیحت کی باتیں ہیں۔وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِیْنَ (69:49) ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ کہنے کے باوجود تم میں وہ لوگ ہیں جو اپنا نام تو مسلمان رکھیں گے لیکن اپنے اندازِ نظام اور مطالب سے ثابت کریں گے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ہم ان لوگوں کو جانتے ہیں۔

تکذیب کا مفہوم

عزیزانِ من! یہاں ایسے لوگوں کو مکذب کہا ہے۔کفر تو ہوتا ہے کسی بات سے کھلے بندوں انکار کر دینا۔تکذیب

ہوتی ہے کسی چیز کو زبان سے تو مانتے رہنا لیکن عملی زندگی میں اسے جھٹلانا' یہ کہنا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے۔ آج زبان سے تو ہم قرآن کی یہ آیت پڑھتے ہیں' جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کبھی کافروں کو مومنوں پر غالب نہیں کرے گا۔ ہم یہ آیت پڑھتے ہیں 'ہزاروں لاکھوں مرتبہ اسے دہراتے ہیں' شبینوں میں دہراتے ہیں۔ مگر ہماری زندگی اس دعوے کی تکذیب کر رہی ہوتی ہے کیونکہ ہم اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں جب کہ قرآن کہتا ہے تم جھوٹ بولتے ہو۔ اسے کہتے ہیں تکذیب۔ ہم یہ جانتے ہیں مگر عملاً اسے جھٹلاتے ہیں۔ آگے آنے والی بات یہ ہے کہ وَ اِنَّہٗ لَحَسْرَۃٌ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (69:50) وہ آنے والا الحاقۃ' جو محسوس کنکریٹ (Concrete)' شکل میں سامنے آئے گا' وہ ان جھٹلانے والوں اور ان نہ ماننے والوں کے لیے' بڑا ہی حسرت کا مقام ہوگا۔ کیا بات ہے ''حسرۃ'' کی۔ حسرت ''واماندگی'' کو کہتے ہیں' یہ تھک کے کہیں بیٹھ جانا ہے' یہ زندگی کی حرارت کا باقی نہ رہنا ہے۔ ان کی یہ کیفیت ہوگئی ہے۔ اور آگے پھر آخری آیت آ گئی۔ مگر آخری سے پہلی کہا کہ وَ اِنَّہٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ (69:51)۔ اس آیت کا ترجمہ کرنے سے پہلے آپ یہ دیکھیے کہ پہلے کہا تھا: الحاقۃ. بات یہاں سے شروع کی تھی اور کہا تھا کہ یہ سارا کچھ جو ہم نے Describe (بیان) کیا ہے' یہ جتنا کچھ جو ہم نے بتایا ہے' یہ حق الیقین ہے' یہ ایک ایسی یقینی بات ہے جو محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں حق ''اس صداقت کو کہتے ہیں جو محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔''

یقین کے تین مدارج: علم الیقین' عین الیقین اور حق الیقین

قرآن نے یقین کے تین درجے بتائے ہیں: پہلا درجہ ہے: علم الیقین کہ کسی چیز کے متعلق ذہنی طور پر سمجھ لینا۔ یہ محض فلسفیانہ انداز ہے۔ جس کو آپ Intellectual (ذہنی' عقلی) کہتے ہیں۔ یعنی ذہنی طور پہ سمجھ لینا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے بھئی! اور یہ سارا فلسفہ' یہ ساری شاعری' اسی میں چلی جاتی ہے۔ یقین کا یہ پہلا درجہ علم الیقین ہے۔ دوسرا درجہ عین الیقین ہے۔ یہ کسی چیز کو دیکھ لینا کہ یہ بھی یقین کے لیے ایک اچھی چیز ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی آخری درجہ نہیں۔ اس سے اگلا درجہ ہے: حق الیقین۔ یہ وہ بات ہے کہ جیسے آگ ہے' دھواں اٹھتا ہے' تو ہم علم کے طور پر اندازہ لگاتے ہیں کہ آگ ہے' جو سامنے بھڑکتی ہوئی نظر آتی ہے اور جب آگ میں انگلی ڈال دی جائے اور وہ جلا دے تو یہ جو یقین ہوتا ہے یہ ہے حق الیقین۔ کہا کہ یہ جو کہا گیا ہے' یہ کوئی یونہی Intellectual (ذہنی) اسی بات نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ دُور سے تم نے کچھ دیکھ لیا ہے اور اب کہتے ہو کہ شاید ہو یا نہ ہو۔ یہ تو وہ چیز ہے جو آگ میں کودنے کے بعد کسی کی کیفیت ہوتی ہے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہماری حالت

یہ جو ہم باتیں بتا رہے ہیں' یہ اِنَّہٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ (69:51) ہیں۔ کتنی یقینی چیز ہے۔ اب اس الحاقۃ سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے؟ بچنے کے لیے یہی کہا تھا کہ تم بھوکوں کی روٹی کا بھی انتظام کرو۔ یہی کہا تھا کہ یہ قرآن اس خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہے جو رب العٰلمین ہے یعنی تمام اقوام کا نشوونما دینے والا ہے: عزیزانِ من! اس سورۃ کی آخری آیت میں کہا کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ (69:52)۔ اب اس آیت کا ہمارے ہاں ترجمہ ہو گیا کہ خدائے عظیم کی تسبیح کیا کرو اور وہ تسبیح ہے: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ' سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمان جو نمازیں پڑھتے ہیں' وہ کتنی ہی بار اس تسبیح کو دہراتے ہیں۔ پھر یہی نہیں ہے کہ یہ رکوع اور سجود میں ہوتی ہے وہ تسبیحیں تو پھر ہزار ہزار دانے کی تسبیحیں ہوتی ہیں:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

چلے ہوئے ہیں' تسبیحیں ہو رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کرنا ہے؟ عزیزانِ من! اس سورۃ کی آخری آیت میں عجیب چیز آئی ہے۔ یہاں خدا کی جو صفت بتائی گئی ہے' وہ ہے: رب العٰلمین۔ ایک ربوبیت تو ''دوسروں کی پرورش کرنا'' ہے یہ تو محدود پیمانے پر ہر شخص اپنے گھر میں کرتا ہے۔ یہ چیزیں تو کافر ہوں یا مومن دونوں ہی کرتے ہیں بلکہ ہم تو اس لحاظ سے مومن کم ہیں اور کافر زیادہ۔ یہاں کہا ہے کہ خدا کی اس صفتِ ربوبیت کو عظیم پیمانے پہ عملی شکل دو۔ صرف محدود پیمانے پہ نہیں' بلکہ عظیم پیمانے پر ربوبیتِ عالمینی کا نظام قائم کرو' اس عذاب سے بچ جاؤ گے۔ سچ کے معنی ہوتا ہے: ''گرمجوش رہنا' سرگرداں رہنا' مسلسل کوشش کرنا' بھرپور کوشش کرنا' متواتر اور مسلسل کوشش کرنا۔'' یہ اس لیے کہا کہ خدا کی صفتِ ربوبیت کے عام کرنے کے لیے مسلسل ومتواتر کوشش کرو' تو بچ جاؤ گے۔ دیکھا آیات میں کس قدر ربط ہے۔ وہ جو کہا کہ یہ عذاب اس لیے آیا ہے کہ تم ان کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے۔ اب کہا کہ یہ اس خدا کا پیغام ہے جو رب العٰلمین ہے۔ پھر کہا کہ اس عذاب سے' اس الحاقۃ سے' بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی صفتِ ربوبیت کو عام کرنے کے لیے مسلسل سرگرداں رہو' تو بچ جاؤ گے' ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الحاقۃ کا آج اختتام ہوا۔ آئندہ درس میں ہم سورۃ المعارج لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀❀❀.....❀

کھاتہ داران/خریدار حضرات

﴿خصوصی توجہ فرمائیں﴾

جن کھاتہ داران/خریداران نے اپنے اپنے کھاتوں سے مجلّہ طلوع اسلام جاری کروایا ہوا ہے ان سے گذارش ہے کہ وہ اپنی فہرست خریداران 15 جنوری 2009ء تک ادارہ طلوع اسلام کو بھجوادیں اور جن کو میگزین سال 2009ء کے لئے جاری رکھنا مقصود ہو یا جن کے میگزین بند کرنے ہوں، مکمل فہرست، ایڈریس، ٹیلیفون نمبر کے ساتھ بھجوادیں تا کہ بروقت عمل درآمد ہو سکے۔ شمارہ کی اشاعت میں اضافہ آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اگر بیرون ملک یا اندرون ملک کی بزمیں مزید تعاون کریں تو اس تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکتا ہے اور پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں میں میگزین بھیجنا ممکن ہو سکے گا۔ امید ہے کہ بزمیں اس مسئلہ پر تعاون کریں گی۔

کھاتہ داران جن کے ذمے طلوع اسلام کی رقم بقایا ہے ان کو ان کے کھاتوں کی تفصیل بھجوائی جارہی ہے تاہم اگر کسی وجہ سے یہ ان تک نہ بھی پہنچے تو بھی تمام کھاتہ داران سے التماس ہے کہ وہ اپنے کھاتوں میں معقول رقم جمع کرانے کا اہتمام کریں تا کہ واجب الادا رقوم کی وجہ سے ادارہ مالی پریشانیوں کا شکار نہ ہو۔

جو قاری حضرات ادارہ کو رقوم بھیجتے ہیں وہ بذریعہ منی آرڈر یا بذریعہ بینک ڈرافٹ ارسال کریں۔ تا کہ بروقت رقم کھاتہ میں ٹرانسفر ہو سکے۔ اگر لاہور سے باہر کا چیک بھیجنا ہو تو 125+225 روپے مساوی 350 روپے ارسال کریں۔ باہر کا چیک اسی صورت میں جمع کرایا جائے گا اگر اس میں 125 روپے بینک چارجز اضافی شامل ہوں گے۔ بصورت دیگر چیک واپس ارسال کر دیا جائے گا۔

بینک اکاؤنٹ کے لئے ضروری وضاحت

1- بینک کا اکاؤنٹ نمبر۔ 3082-7

2- بینک کا نام۔ نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ برانچ گلبرگ، لاہور (پاکستان)۔

3- نام اکاؤنٹ۔ ادارہ طلوع اسلام

شکریہ

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام لاہور

JOURNEY OF MY LIFE

By

Dr. Shaguftaa Tahir, Karachi

Wajud-e-zan say hai tasweer-e- kaainaat may rung
The universe gets its beauty from Female's existence
Usee kay saaz say ahi zindagi kaa soz-e-darun
It is her music that is the essence of tender life–Iqbal.

God has bestowed the tender gender—Woman—with gifts of emotions and feelings. When she plucks the strings of her 'being' in the quietness of nature, all sorts of different colours and shades vibrate to join in. When observed dispassionately, away from the prejudices of, race, colour and geography, she is found to be struggling to step beyond her shell.

When the Creator of the Universe created her, it instilled in her all the necessary attributes of femininity that were required to help run the word's scheme- of- things. Who else but the Creator can analyse what her position and status should be? At what level she should be placed in the workings of nature? On one hand she is a fellow traveler for Male, a corner of tranquility and comfort of life and on the other hand she seems to be a picture of blessing where in 'a little acorn grows in to mighty oaks'. To protect them she has the courage to tackle mountains. So, has this being acquired her true place in the world?

Dear readers, the subject on which the Creator has put pen to paper, making Rule and Regulation for its creation, it has preserved those in the Quran, addressing humanity as a whole. To quote Iqbal, 'if I did not know the Quran or were a non-Muslim, I would have said that the book was written by a female to give her own self that higher position which no other religion has given her!!!'.

With a little thought, we would not have to go far to see at close quarters the picture of her desperation. This 'being', who's existence the Poet of the East attributes to have beautified the universe; how the culture of 'Man' has her degraded. It is not a secret for us all to see. Whether they are the fortifications of traditions or the sentinels of religions, are all meant to keep her on straight and narrow. Cast a glance at any part of the world

or religion, woman will be found to be struggling for her basic Human-rights. So let us ask, why is it so?

The one who should have been given her Human Rights, failed to acquire them! Despite the fact the Lord had often times sent His messengers to elaborate them. This message was endorsed by many Messengers and again confirmed through the 'Seal of Messengers'. All religions had changed the basics of the message. The Ajam(non Arab lands) too did not lag behind to join in this wicked conspiracy.

After having included all the falsehoods in their explanations of Quran, they then proceeded to issue such Fatwas (edicts) that no body would dare to question even though they were allegations against God Himself. The Quran itself gives evidence of corruption in this concocted corpus which, are quoted as evidence of Quran being-- God forbid-- as incomplete document. This very corpus (it is insisted) should be used to understand the context, otherwise; firstly Quran can not be understood without these stories and if it were to, the Devil would lead one astray and thus one would be ostracised from Islam, therefore, one must not use one's intellect, in particular to understanding of the Quran, they say.

What ever the (long departed) elders-of-the-Deen, the religious lawyers and scholars had written, was the distillation of their life-time work and so what ever they had preached must be followed. Because these stories as such were hand-me down from Torah and Bible under a well thought out conspiracy, they were included in the 'Traditions/hadis' corpus and are associated with these elders.

Any research on them is even forbidden. Thus all factions are locked in their own hear-say, and therefore each faction considers the other faction as infidel. Now consider this, if these instructions were Islamic, then would not the Messenger himself have established them and would God not have endorsed them? However this we have to admit that the hearsay Islam has destroyed the analyses of Islam and of the Muslim-people, and we can not brush aside the fact that we have to investigate these people who are supposed to be the custodians of Quran and that the promise of heaven is through them only?

The word of the Creator-Cherisher of universe even today reflects as a clean mirror and can show every body's reflection clearly, on the condition that one wants to see it. How far have the Muslims been successful in this,

is but quite obvious. The way they have projected their cultural, society and family/domestic practices to the world at large; unfortunately one must say, the female gender in it, is ashamed of even being a woman. Shackled in the falsehood of religions, she endeavored to find a messiah; she did find some support but never could find a true companion or fellow traveler. Today the very meanings of these words are changed. We have no idea of self respect nor do we value the importance of maintaining the dignity of others. What is preferable to us is the standard of our false status as seen by others. All standards given by Almighty seem to be made suitable for others to surmonise us with. To implement them for one self, it would be necessary to make further changes to them.

Please contemplate how this duality of standards has inflicted deep wounds on our basic values.

When we contemplate on the scheme of God's creation, we see that He has created every thing in complementary pairs; for example in plants, animals and minerals; even such as day and night, heaven and earth, hot and cold, light and shade and so also the complement of this world is given as the Akhira. Then what is so strange in the pairing of man and woman? Quran refers to these pairs as complementary. But alas, we only have a 'wife' in our vocabulary never a partner(spouse).

No animal in the world has maintained such discriminatory relation as has the mankind with the female gender. Watch the life of a lion and lioness. No discrimination there. Both eat the same type of hunted food, live in the same environment; only the responsibilities of propagation of species differ, which is ingrained as instinct in female nature. Never will we see the lion growl, stare in anger or dominate the lioness. Both will be seen to live in their own limits of duties.

Human kind is a social animal who is not endowed with instinctive self, which differentiates it from others animals. That 'self' needs to be cultivated. This cultivation is imposed as the responsibility on the society and parents. This training programme starts from mother's lap to end at the brink of grave. God has not abrogated these responsibilities, for He sent His Messengers to guide mankind. When ever mankind was drowning in sin, He opened the doors of salvation. Mankind having successfully gone through this training is then referred to as Momin and Mominaat –believers includs both genders. He conveys eternal bliss for both.

We know that there are at least four female relationships that have an effect on man's life. That is there is a clever and capable woman behind a successful man-- and so we can say there is a visionary man behind every successful woman too. If a mother, then her lap is the first training ground for the child from where it obtains the art of successful life. In this nest it flaps its wings for flight. When it joins the hustle and bustle of the world, it becomes an aviator who tests himself for confidence prior to taking mankind safely in the outer space. This Momin-being is called Alim-a scholar- in the context of Quran.

Nations make their destiny in mothers lap. Almighty God has implemented rules and regulations for the training of this mother and for her security and protection has created the Man. For, after providing the training of this being, even as a sister, wife or daughter, 'will ever Nargis make the garden fragrant' and play her music of happiness. She would not then shed tears on her lack of sight as to when, where and in which century will come a visionary who might bring a revolution in the world.

After contemplating the needs and purpose of this issue, we wish to analyse the reasons why then Man did not establish the relationship with the female gender for which he was created??? Before raising it on the pedestal of nobleness, mankind was equipped with Wisdom, Understanding, Will and Capability, so that when thrust with responsibilities, it should find no way of escape.

One would not be particularly pleased to know that the weaker gender in this rainbow world we talk about has ever found a sanctuary any where. History of million years is a witness that if ever the rights of any were trampled upon, it is the female's. If ever any human enslaved another, it was the Man who shackled this fellow traveler. A tender, kind hearted and innocent, harbouring many dreams, she has been turned by Man into a stupid, unintelligent, weakling and responsible for the 'original sin'. And then designated him as superbly-blessed, blue-eyed-boy of creation and the very reason for which this Universe was created. As a result the female herself begins to believe that it is her fault and destiny to be at the bottom of the rubbish heap. Her thinking power was reduced to the extent that she forgot to demand her given human-rights. One does not have to go far to see how badly she is treated. Even in today's scientific twenty first century the way she is oppressed, not even one tenth of it is allowed to come to the surface.

According to Christianity, woman was kicked out of heaven for her Original Sin. Esquire Adam too was sent packing from there because of her. In the gospels, the female was created as a play thing for him and that too from the most crooked left rib of his. So it is established that it is very difficult indeed to straighten the female. In fact, it is well-nigh impossible. She can not be straightened, but can be broken, or she can be just tolerated; yet there is always that danger of being branded as 'a softy' to have to do so.

It is a different matter when mere attraction turns into an infatuation for her and so he runs around with his lapel torn. Even then he heaps his deranged state of mind on the poor woman, herself a creature tormented for generations. Do you agree that it is a heart wrenching story! The cry of our Piety-brigade can be heard that --*they do what they will, yet 'heap the bucket' on us.*

The cruel practice of the Arabs was to burry their girls alive, but the progressive Western culture is no less cruel where the female does not find security under any canopy, so much so that a daughter is not safe from her father and brothers.

Our progressive culture is strange in that it considers a daughter's journey from birth to adolescence as a responsibility and a burden and endeavors to cast her off in haste. It is commonly acknowledged the difference in the upbringing, education, training and feeding of sons and daughters. Some will scream that- 'No! no such things happen among us. We consider a daughter as God's blessing'. But when the question of a daughter's bride-gift, division of estate and if the girl expresses her wish to marry a person of her choice arises, particularly then, how much her wishes are respected, is not a secret.

We are indebted to Hindus. Our social system is a store house of the influences of their culture. Wrapped in silken clock of religion we take revenge on past and present generations in that environment. Being very sensitive, we turn a slightest incidence into a tempest of ego for the society to deal with. But fail to extract from that typhoon a smallest shell that should show us the way forward for action. In the domestic world strange stories give birth, stories which are based on strained relations, enmity, revenge, and jealousy, all misdirected emotions. What has knowledge based and guided upbringing, which is the foundation of human development got to do with such trash?

Where as Islam establishes the relationship of Humans with Almighty, it also lays down the solid pad for domestic and family relationship in which man and woman make a blissful life. The responsibilities it has imposed on each other, includes the maintenance of dignity and rights for each. The household where there is freedom of thought and life organized based on knowledge; there only the younger generation can obtain proper guidance.

Islam rejects the notion that Eve was created after Adam and from his ribs. *"God has created you from one life source and created from it many compatible beings"* that is to say that life source got divided in to two and " *from these many males and females were spread round the world 4:1".*

The single self or the one cell, progressed through developmental stages in organism and limbs to appear in the shape of mankind; through the two genders and from the mothers womb. Hence they are similar in all aspects of life. Then the Quran says *" from whence We created complementary partners for you 30:21'42:11"*

The 'spouse' or partner is said to be complementary partner/friend, a spouse who completes both and makes them whole and further it said "*you are from each other 3:195*". None alone can be whole without the other.

Quran also refutes the allegation of the Christians that the female is responsible for leading the male astray. And that she was misled by the Devil and so was responsible for Adams expulsion from heaven. Quran elaborates that *"the Devil misled both simultaneously2:36".* Thus they both share the blame for having sinned, then they both asked for forgiveness and so both are made *worthy of Dignity70:71.* This means that not only the male but the female too is worthy of dignity.

Entire life for humanity depends on balance in nature. Is it then possible that this balance is made dependent on one gender only, either the male or the female? Customarily the balance is considered as through one gender only, any wonder then that we see imbalance in our society! We consider only one half as constituting humanity. Then too one half is graded such that 99% is separated and only one per cent remains to make up the higher grade.

As was said before, that one status the female has been given by nature, is that of giving birth, thus the making of a nation, which is solely dependent on her capacity to do so. This specialty is the society's absolute necessity. What ever type will be the mother, will the society be constituted of. That is the reason why Quran uses the word Ummah for society. The root of this word is Umm which means mother. With such a heavy responsibility on her, is it then not a suicide of a nation to hinder and restrict her upbringing and development?

Today's girl is tomorrow's mother. If her health, education, freedom of thought, independence and understanding, is usurped, can she ever dream of elevation and higher status for herself??? Certainly not!!! Dr Iqbal has said:

Jis ilm ki Taaseer say zan hoti hai nazan
The effect of the education that robs a female's femininity
Khetey hain issi ilm ko Arbabey nazar maut
The visionary Scholars call such education as 'death'
Begaanah rahey Deen say agar madrasaa-e-zan
If the girl's-schools were to be neglectful of Deen
Hai ishq wa muhabat kay liye ilm wa hunar maut
For love and affection this knowledge and craft is 'death'

The responsibility of her education and training has been put on the male. Says Quran --*"The procurement of sustenance, in general, is the responsibility of man. For this he has been given additional skills and women different skills 4:34".* Therefore the man has been instructed to provide from his earnings for the needs of women. (*Qaa'ma alaiha* means to provide her with sustenance) so that she fulfils her responsibilities too, including those of child rearing, the capability of which has been given to her off-sight. However this has been translated to mean as—'righteous wives are obedient to husbands and men are placed as constables on them. Women should guard their modesty and their honour in men's absence)' as if this is only required of woman, although in Chapter Ahzaab's verses in Quran it is incumbent upon both gender to do so. This notion is therefore false because the relationship between man and woman is that of partnership. Such anomaly in a partnership can not exist in one part being 'subservient' to the other!!!

Both men and women are enmeshed in the workings of this world and are locked in the laws of God. Both are part of the community or the nation.

The relationship of Master and Slave is vehemently condemned by Quran and the attainment of heaven is assured only through individual's Righteous actions, and as such heaven is obtainable to both. The laws of nature can not be changed preferentially for the mere fact that one is born a male.

Fard qaim rabt-e-millat say hai tanhaa kutch nahin
Individual exists due to the coherence of community
Moj hai daryaa may aur beru-e-daryaa kutch nahin
A wave exists but in the ocean, out of it has no existence

Let us proceed to the next part of the verse and we find the ruling as to what action a husband can take on the wife acting disobediently. We take the following ruling from conventional translations. Here it is considered necessary to investigate if this ruling exists in Quran or not.

Of those women you fear excesses, so advise them and confine them in their bedrooms and beat them. If they obey you then do not go heavy on them, indeed God is great 4:34.

It is found from the beginning of the verse that the subject is not of family or a domestic dispute but it is where Almighty is laying down rules and regulation for interactive responsibilities of man and woman within a society. Man is made 'the provider' and woman 'the keeper of the Home', where she rears the young, develops her own person and benefits from the facilities given of education and training. But if she, in spite of all these facilities, goes astray then she should be counseled, then house bound as a further counseling and failing this as a last resort further action is taken through the court, which within limits of law, is empowered to give appropriate punishment.

Dear readers, we all know how a husband, behind the facade of male-authority humiliates her person, alleging disobedience to him for not caring for his parents and siblings according to his expressed wishes. In our society, has any civil or community court ever decreed as to what are the limits of punishment for a woman for disobedience to her husband???

A man is not even considered 'disobedient' (guilty) when he does not provide for her and children's basic sustenance. Neither the society nor the religious factions then punish him. Man, with no questions asked, imprisons her in the house such that she can not even attend the funeral

of her parents. Who then comes to her aid? This we witness every day, there is no exaggeration here. Has the husband ever been challenged for the demands he makes of her, and where is it ordained in the God's laws?? No, never!!!

The common occurrence is, this woman is beaten by her husband, the family according to their ability some times abused verbally, sometime burned with the help 'of a stove', some time with a bed-sheet and some times sacrificed to the concocted traditions of 'karokari' to murder her. No body comes to know of it or cares. At best they punish her with 'life' sentence to make it an eternal hell for her!

Few days ago, two ladies were murdered (in Pakistan). No investigation was carried out by any court nor by the authorities. Thus the women were sacrificed on the alter of Man's- ego. Will not God ask about this case as to why the women were murdered *81:9*??? Please answer—if the other religions have branded her sinful and shameful, degraded her bellow the status of humanity, then it is true that the custodians of Islam have not considered her as worthy of mercy too?

For years non-Muslims scholars were confounded for they were debating whether a woman has a soul or not. To these thinkers, the soul is pristine and so a woman--being impure-- could not posses it, only a man could have a soul. So it is also a question as to what protection the Code of Islam has given her???

Thus far we have been analyzing one verse to determine the chaos created in the society, which has no empathy to offer; for the concocted and as practiced Islam has even established their correctness from Quran, to say that, if she disobeys you, then beat her, but in the exegesis a sort of kindly allowance is made to her that no mark should be left on her body!

When in rage only then one does come to blows; who then remembers what happened. Who cares for the left over ashes after the bush-fire has passed???

Quran imposes self control, gratitude, relationship and gives lessons of love. The woman devoid of education, brain-dead for the last fourteen hundred years of our history, for its diagnoses, perhaps this is not the place!

However, did our Shariya courts ever ruled in the context of man-woman's working of their relationship according to the rulings of the Quran??

They obtain proof from their customs and rulings from the religious lawmakers (of the past), according to whom the women really should be proud of being obedient servants of the men. If she is kept as a slave by him, even then she should not complain. A book called 'Beheshti zewar' by Ashaf Ali Thanwi will provide further details of this (mind-set). That is why one will find on the deep dark pages of life, womanhood howling in pain and anguish, irrespective of her social status, place and language. Only a fraction of a percent may have obtained their Rights, but in this world those who are ground between the two mill stones, are innumerable. In the environment where her right to speak is locked , wisdom and understanding capacity constricted; from such a lap it is not possible to cultivate the likes of Muhammad bin Qasim , Tariq bin Ziyad , Qaid-e-Azam or Dr Iqbal! The sort of child-personalities that would emerge from this enslaved and handicapped mother's lap, one can only guess!!!

Quaran's ordinances are fixed and there is no room for any change in them. Is not now necessary to consider as to why we are so wretched. The poet of the East has said:

Hai kis kee yeh jurat khey Musalman ko tokay
Who dare growl at a Musulman
Huret-e-afkaar kee na'mat hai khudadaad
Freedom of thought is God given blessing
Quran ko baazicha-e-taaweel banaakar
Converting Quran in to an Exchange mart

Chahey toe khud aik shariet karay ejaad
They wish to invent a new religious code
Hai mamlikat-e-Hind may iktarfaa tamaashaa
There is one sided pantomime in the State of Hind
Islam hai mehboos Musulman hai azaad
Islam is imprisoned though Muslim is free

The outcry for woman's right may have given impetus to sexual waywardness but the system of life in terms of economic and societal matters is taking a ruinous path.

The woman unfortunately is not aware of her own rights, so the rights she is claiming have now included all those additional responsibilities that were once male's domain. She now earns for the man, and along with that is burdened to provide for the rest of the family too. Hence woman's own life is even more difficult.

The Western civilization has converted her into a society-flame and placed her at various places so that copious entertainment can be provided for man, as a result none is found to be genuine and both are now lonely. Neither the pure love of parent is there nor the innocent love and affection of siblings exists. It is inevitable that when in the partnership, love and loyalty which are the foundation of a marriage 'home' are destroyed, the balance of the society is bound to be ruined. This man-made system can never with justice allocate responsibilities. As God has warned that a woman can hardly present her own case, for you have decked her in ornaments, so in disputes she can not even present her purpose of being 43:18.

Let us then think, when God Himself is concerned about the plight of His creation and describes her nature clearly then would He abandon her at the mercy of mankind??? No, never, it can not be so!!! To believe so is it not a slander on Almighty???

Quran has elevated the woman to the position of the 'female-believer', up above the depth of mankind and foretold of the eternal bliss through her. Having ordained all her Rights divinely, He made the male responsible to provide her those rights in practice. It is a trust that Almighty has placed upon the male believers. Those who fulfill this trust will inherit this world's and the hereafter's heavenly bliss. Their fields will be fertile and gather golden harvest. Such societies can only prosper with Almighty's blessings. It is not within the capacity of mere man alone to do so!!! According to the poet:

Jinhen haqeer smajh kar bujhaa diya tuney
Those that you extinguished as mere ordinary
Wahi chiraag jalengey toe roshni hogee
Only with those lamps there will be a light when lit.
==========